دیا اور دریا
(ناول)
Meer Zaheer Abass Rustmani
افضل احسن رندھاوا
ترجمہ: زاہد حسن

نظم و نثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی کتابیں

عاشق من الفلسطین

تاریخی، سیاسی، سماجی تجزیہ

شعر و افسانے کے انتخاب کے ساتھ

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

دیا اور دریا

(ناول)

افضل احسن رندھاوا

ترجمہ:

زاہد حسن

Diya Aur Darya

By. Afzal Ahsan Randhawa

Translated By. Zahid Hassan

اشاعت: جنوری ۲۰۰۱ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

سرورق: خدا بخش ابڑو

طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر

بی-۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

scheherzade@altavista.com

کچھ ناول اور ناول نگار کے بارے میں

افضل احسن رندھاوا محبت کے بارے میں لکھتا ہے اور انتقام کے بارے میں۔ اس کے لکھنے کا محرک یہ ہے کہ شاید ایک دِن وہ محبت کے بیچ چھپے ہوئے بھید ڈھونڈ لے گا اور انتقام کے پیچھے کارفرما جذبات وعوامل کا ردِعمل بھی۔

کچھ اہم لکھنے والوں کی طرح محبت رندھاوا کے یہاں اہم مسئلے کے طور پر در آتی ہے اور وہ اعلیٰ انسانوں، قدروں اور جذباتی روّیوں کی ترجمانی کرتا ہوا محبت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔انتقام کے حوالے سے بھی اُس کا روّیہ یہی ہے۔ اِس تخلیق کار نے پنجابی زبان کو کہانی، ناول اور شاعری کی اصناف میں بے پایاں شہ پارے دیے ہیں۔لفظیات اور بیان کے حوالے سے وہ اپنی تخلیقات میں داستانوی اسلوب برتتا ہے جو پنجابی ادبیات کی بنیادی اور اہم خصوصیت ہے۔اسی بنیاد پر اُس کی تحریریں آپ کے وجود میں سنسنی پھیلا دیتی ہیں۔ مشاہدے کی باریکی اور گہرائی اُس کے فن کا حصہ ہے۔

محبت اور انتقام کو تخلیق کرنے والے اِس فن کار کا بنیادی فلسفہ عام مفہوم اور معانی سے ذرا بلند ہے۔ جس کی تفہیم کرتے ہوئے اُس نے کہیں لکھا ہے ''جہاں تک محبت اور انتقام کی

بات ہے محبت اور انتقام کے بیچ کارفرما اسرار کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں نہ ہی شاید کبھی جان سکوں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ محبت اپنے آپ کو سارے جنموں میں مار لینے کا نام ہے اور انتقام دوسرے کو ایک ہی جنم میں مار دینے کا۔''

ذات، قوم، قانون، سماج اور روایات کس طرح محبت کی کونپل سے پھوٹنے والے اعلیٰ ترین آدرشوں کا قتل کر دیتے ہیں، یہی اس ناول کی کہانی ہے۔ اور قاری پر ابلاغ کی تمام تر پرتوں کو احسن طریقے سے کھول دینے کے کارن ہی یہ ناول کامیاب بھی ٹھہرتا ہے۔ ایک سطح پر جندو اور روپو کی صورت میں مصنف ہمیں عورت کا استحصال کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل یہ استحصال نہیں، انصاف ہے۔ کیوں کہ کسی بھی بھلا دیے جانے والے کو اس کے حقوق کا شعور دینا انصاف کے دائرے ہی میں آتا ہے۔ اب انصاف فراہم کرنے کے سلسلے میں ہر انسان کی اپنی اپنی سطحیں ہو سکتی ہیں۔

ساٹھ کی دہائی پنجابی ادب خصوصاً پنجابی ناول کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اسی دوران افضل احسن رندھاوا کا یہ ناول چھپ کر سامنے آیا۔ رندھاوا نے پہلی بار دیہاتی تہذیب میں پائی جانے والی دلیری، غیرت، رسم و رواج، خوشی اور دُکھ درد کو اپنا موضوع بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ میراں بخش منہاس نے دیہاتی جیون کے ایک پہلو کو اپنے ناول ''جٹ دی کرتوت'' کے ذریعے متعارف کرایا لیکن رندھاوا نے سارے جیون کو اپنے ناول کے وسیع تر اور بھرپور موضوع میں نہایت فن کارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بات سہج کہی جا سکتی ہے کہ اس ناول کے تمام تر کردار سکھ مذہب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اس نوع کے کردار موجود زندگی جس کو ہم معاصر پاکستانی پنجاب کی جیونی کا نام دے سکتے ہیں، ہم اپنے چار سو جیون بتاتے دیکھ سکتے ہیں۔ عین وہی معاشرت، وہی تہذیبی سماجی رہن سہن، وہی انتقام کی آگ اور وہی محبت کی شیرینی۔ یہی پنجابی لوک رہس کی بنیادی خاصیت بھی ہے۔ جس کو ہم عہد حاضر کی جدید تر انسانی تہذیب کے آئینے سے دیکھ سکتے ہیں۔ یوں یہ ناول کافی کچھ وقت گزر جانے کے باوجود بھی پنجاب کی مرکزی نفسیاتی کش مکش اور اُس سے جنم لینے والے حادثات اور واقعات کو بہ طریقِ احسن پیش کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم یہ جانتے ہیں کہ پنجاب میں آباد جاٹ قوم کی معاشرتی زندگی کے کچھ اپنے تفاخر، اپنی انا، عزت، ریتی رواج اور سوچنے کا انداز ہے۔

اپنے عہد میں اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی بار

ستمبر ۱۹۶۱ء میں مکتبہ پنجابی ادب لاہور نے چھاپا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے اس کو ۱۹۶۱ء کا بہترین ناول قرار دیا۔ دوسری بار روزنامہ ''انجام'' پشاور نے قسط وار چھاپا۔ تیسری بار جالندھر (انڈیا) میں چھاپا گیا۔ اور چوتھی بار اگست ۱۹۷۱ء میں پنجاب پبلشرز، لاہور کے توسّط سے یہ ناول منظر عام پر آیا۔ پاکستانی پنجاب میں کسی بھی ناول کی یہ ریکارڈ اشاعت ہے۔ عام پنجابی ناول میں ہنوز اس کی مانگ اُسی طرح ہے۔ بہت عرصے سے اشاعت پذیر نہ ہونے کے باعث نایاب ہے۔ اپنے دوسرے ناول ''دوآبہ'' کے شروع میں ''دیواتے دریا'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے افضل احسن رندھاوا لکھتے ہیں:

''۱۹۶۱ء میں ''دیواتے دریا'' پاکستان اور اس کے بعد بھارت میں چھپنے پر اس کے حوالے سے ایک طویل بحث چل نکلی اور مجھ سے دیہاتی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ایک اور ناول لکھنے کے بارے میں اصرار کیا جانے لگا۔ ۱۹۶۳ء میں بھارتی پنجاب کی ایک پنجابی یونی ورسٹی کی طرف سے بھی ایک ایسا ناول لکھ کر دینے کے بارے میں کہا جانے لگا۔ یہاں بھی فلم کی کہانی سے ڈراما تک لکھنے کے بارے میں کہا جاتا رہا۔ میرے انکار پر ''دیواتے دریا'' کو ہی توڑ مروڑ کے ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے کچھ بنا دینے کے اوپر زور دیا جانے لگا۔ پر میں ''دیواتے دریا'' کا خون اپنے ہاتھوں کیسے کرسکتا تھا۔''

افضل احسن رندھاوا کے کردار اپنی دھرتی کی مٹی سے اپنے بدن کی مہک حاصل کرتے ہیں۔ وہ پنجاب کی گمبھیر اور بھرپور ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ ''دیواتے دریا'' کسی ایک فرد، عورت، گھر خاندان یا گاؤں کی کہانی نہیں، پورے پنجاب کی کہانی ہے۔

اُن کی اپنی ذات کی طرح اُن کا فن بھی دھرتی کے بہت قریب ہے۔ اُس کے کرداروں کو پنجابی لوگوں کے دُکھوں، دردوں کی پہچان بہت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن کے ناول اور کہانی میں پنجاب اور پنجابیت کا رنگ ایک علیحدہ طرزِ زندگی میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ پنجابیوں کی غیرت، دلیری، بلند حوصلگی اور زندگی گزارنے کے سبھاؤ، محنت مشقت کرنے کا فخر، یہ سارے ایسے گن ہیں جن کو رندھاوا نے اپنی تخلیقات میں بھرپور طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ ان سب پہلوؤں کے حقیقی اظہار کو اپنے فن کی طاقت بنا کے برتتا ہے۔ وہ مٹی ہوئی جانگلی تہذیب کا خالق ہے۔ پُرانی مٹی سے بنے اس شخص کا کمال ہے کہ شہری نفاست نے اس سے اپنی میراث چھینی نہیں بلکہ سجے سنورے شیشے سے ماحول کے پسِ پشت کارفرما منافق روّیوں نے

اسے اپنی تہذیب سے اور زیادہ مضبوط اور پائدار رشتوں میں منسلک کر دیا ہے۔

''دیوا تے دریا'' میں بیان کی گئی کہانی کو دیکھا جائے تو موضوعاتی اعتبار سے یہ ایک سادہ اسلوب میں حقیقت نگاری کی ایک مثال ہے۔ صدیوں سے موجود، پنجاب کا انتقامی ماحول، نسلی اور قبائلی تفاخر کی بنیاد پر نسلوں تک چلنے والی لڑائی، دو مخالف قبیلوں کے لڑکی/لڑکے کا عشق، خاندانی مریادا کی پاس داری کا خیال وغیرہ۔''دیوا تے دریا'' میں بھی رندھاوے اور سندھو، روپو اور شمشیر اسی تہذیب اور سیب سے پھوٹنے والے خمیر کی علامتیں ہیں۔ کہانی میں ناول کا ہیرو شمشیر سنگھ اپنے دشمن سندھوؤں کی بیٹی روپو سے عشق کرتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی خالہ زاد اور منگیتر جندو کو قتل کر دیتا ہے۔ جس کی بنیاد پر اُس کو اپنے بڑے بھائی ہر بچن سنگھ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ شمشیر سنگھ انکھی اور دلیر ہے۔ روپو کی شادی کے عین موقعے پر اُسے بھگا لے جاتا ہے۔ لیکن راستے میں اُس کا بھائی ہر بچن جو کہ پورے گاؤں کی عزت کو اپنی عزت اور دشمن کی بہن/بیٹی کو اپنی بہن/بیٹی سمجھتا ہے شمشیر کو روک لیتا ہے۔ آخر کار، شمشیر کے دماغ میں ایک نیا نکتہ آتا ہے اور وہ ایک غیر متوقع قدم اُٹھاتا ہے۔ ایک سطح پر دیکھا جائے تو اس کہانی کا ہمارے کلاسیک میں موجود ایک نہایت اہم لوک کہانی ''مرزا صاحباں'' سے بہت گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ یوں بھی رندھاوا نے ڈھاڈیوں اور گویوں کے ذریعے مختلف مقامات پر اس کہانی کے اہم واقعات کے بیان کا تڑکا لگایا ہے۔ اس سب کے باوجود ہمارے خوابوں میں ایک پنجاب آباد ہے جو رفتہ رفتہ ماضی کا حصہ بنتا جا رہا ہے جس میں غیرت مند نوجوان ہیں، الھڑ مٹیاریں ہیں، پنگھٹ ہیں، ہرے بھرے کھیت ہیں، بوڑھے ہیں، پنڈال ہیں، گائیک ہیں اور ہیر وارث شاہ ہے۔ میلے ہیں، کھیل ہیں، گھوڑے ہیں، سوار ہیں اور گھوڑوں کے بھید جاننے والے ہیں، لیکن لکھاریوں میں ایک صرف یہی رندھاوا رہ گئے ہیں۔ جو اس سارے تہذیبی اثاثے کو اپنے ساتھ لیے چل رہے ہیں۔ ان کی اِس خوبی کے بارے میں سجاد حیدر نے لکھا ہے:

''اگر افضل احسن رندھاوا یورپین سمراٹھوں کے زمانے میں پیدا ہوتا تو اس کے سرکوٹ (surcoat) پر گھوڑے کا نشان کندہ ہونا تھا۔ وہ گھوڑوں کی بہت پہچان رکھتا ہے۔ اُن کے ساتھ بہت زیادہ پیار کرتا ہے، جیسے سب چابک سوار، سب شہ سوار کرتے ہیں۔ اس طرح کا جوان گھوڑے پر سواری کرتا ہی اچھا لگتا ہے لیکن اب شہ سواری کا زمانہ نہیں رہا۔ گھوڑے تو اب بھی ہیں لیکن اُن کے سوار ہی نہیں رہے۔ افضل احسن کو پڑھ کے حوصلہ ہوتا ہے کہ ابھی یہ میدان

سواروں سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے۔''

ہاں! ہمارے اتنے بڑے ادیبوں کے گروہ میں سے واحد افضل رندھاوا ہے جس کے یہاں ہمیں اپنی پوری تہذیب تمام تر معانی کے ساتھ نظر آتی ہے، اس کے کرداروں کے سانسوں میں خوش بو لیتی ہوئی۔ اُس کی کہانیاں اور ناول پڑھ کر انسان بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے، یہی تو ہے وہی پنجاب، جس کی ہمیں تلاش تھی۔

جہاں تک اس ناول کے ترجمہ کرنے کا تعلق ہے، تو ''دیا اور دریا'' کے ماحول نے مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کیا ہے۔ میں اب تک اس کے رومان میں مبتلا چلا آرہا ہوں۔ اس بات سے بہت سے معاملات جڑے ہوئے ہیں میری اس ذہنی اور نفسیاتی جذباتیت کے۔ یہ جذباتی واردات جو آپ کو ایک سطح پر خارج سے بیگانہ کر کے اپنے اِردگرد کے سحر میں جکڑ دیتی ہے۔ میرے نزدیک شعور کی یہ اعلیٰ ترین سطح ہے کہ یہاں سے آپ کو اپنے کلچر، تہذیبی و ثقافتی رویوں، لوک داستانوں اور لوک گیتوں کو اپنے تن بدن پر ہنڈھانے کا سلیقہ حاصل ہوتا ہے، گو اس ناول کی حیثیت پنجابی ادب میں کسی لوک داستان کی حامل تو نہیں، پر جدید پنجابی کلاسیک میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اور میرے لیے تو یوں بھی ترجمے کا یہ تجربہ ایک عمیق رو کی مانند ہے جس کے اوپر بہت سی لہروں کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ یہ تجربہ آپ کو مستی کی اس ترنگ سے روشناس کراتا ہے۔ جو ہمارے خوابوں میں کہیں روحانی سرشاری سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ اسی سرشاری سے ہم آہنگی ہی میرے اس ناول کے ترجمے کا، کارن بنی۔ لیکن اس کا دائرہ کار صرف میری ذاتی مسرت تک ہی محدود نہیں کہ اگر آصف فرخی صاحب مجھے اس ترجمے کی تحریک نہ دیتے اور طارق رحمٰن فضلی صاحب اس کو شایع کرنے کی، تو یقیناً میں اپنے ماضی کے شیلف میں دھری اس کہانی کی جانب دوبارہ رجوع نہ کرتا۔ اور اب جب کہ یہ ناول آپ کے سامنے ہے تو اس کے پیچھے میری اس ناول سے جڑی رومانویت، آصف فرخی صاحب کی ذاتی دِل چسپی اور رندھاوا صاحب کی لگن ہے ناول کی زبان اور فقروں کی ساخت، پرداخت. میں بھی ان دو اصحاب کے صائب مشورے شامل ہیں۔

رندھاوا صاحب نے جب یہ ناول تخلیق کیا، اُس وقت وہ کس رو سے گذر رہے تھے؟ کس صورتِ حال سے دو چار تھے؟ اس امر کا احساس بہت حد تک اس ناول کے کرداروں اور موضوع کی انفرادیت سے ہو جاتا ہے...... اس ترجمے کے مکمل ہونے پر جہاں انہوں نے خوشی کا

اظہار کیا وہاں پر ہی ترجمے کو پوری توجہ سے پڑھا اور بعض مشورے بھی دیے۔ یوں یہ ترجمہ اُن کے مطالعے سے گذر چکا ہے اور اس طرح ترجمہ کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

زاہد حسن

لاہور، ۲۰ دسمبر ۱۹۹۷ء

سردار اُجاگر سنگھ رندھاوا کو یوں لگا جیسے حاکو کھرل نے اس کو ماں یا بہن کی گالی دے ڈالی ہو۔ اُس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ قہرناک ہوکر دو چار گھڑیاں تو گم سم حاکو کھرل کو دیکھتا رہا۔ اس کی شراب سے سُرخ آنکھیں اور زیادہ سُرخ ہوگئیں اور اس کے بوڑھے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑ کنے لگیں۔ یہ بات سنتے ہی اس کے کہن سالہ خون میں آگ لگ گئی۔ اُس نے شراب کا خالی گلاس دور پھینک دیا اور چارپائی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ پھر وہ حاکو کے نزدیک آ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا ''تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

''بات تو پوری سن لو اُجاگر سیاں۔ یونہی لال پیلے ہو رہے ہو''۔

''میں نے اور کوئی بات نہیں سننا، تم بتاؤ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' اُجاگر سنگھ ویسے ہی غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔

''نہیں۔'' حاکو نے اُٹھ کر اُجاگر سنگھ کو بازو سے پکڑ کے پاس بٹھالیا۔

''تو؟''

''تاجے نائی نے دیکھا تھا۔''

''تجھے تاجے نے بتایا ہے؟''

''ہاں۔''

''تاجے کی بات پر اعتبار ہے؟''

''ہاں ہاں۔ تاجا، ہم سے جھوٹ بول سکتا ہے بھائی؟ یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ چھوڑ اس بات کو۔ میں شمشیر کو سمجھا دوں گا۔ تو اسے کچھ نہ کہنا۔ منڈا کھنڈا ہے آخر۔'' حاکو نے اجاگر سنگھ کو سمجھایا۔

''میں اُس کی ٹانگیں کاٹ دوں گا حاکو۔ دھرم سے، میں اُس کی ٹانگیں کاٹ دوں گا۔''

''ارے چھوڑ اس بات کو بھائی۔ تجھے کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا ہے''۔

''حاکو! یوں نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں اُس ماں کے خصم کا سر کاٹ دوں گا''۔ اُجاگر سنگھ بولتا چلا جا رہا تھا۔

''اُجاگر سیّاں! ہوش کر۔ سننے والے کیا کہیں گے اور پھر شمشیر کوئی بچہ نہیں۔ جوان جہان گبھرو ہے۔ تو اسے کچھ نہ کہنا۔ میں سویرے ہی اُسے سمجھا دوں گا۔ اور اب تو آرام کر کل صبح سہی''۔

اور حاکو کھرل اپنا کھونڈا پکڑ گھر کی طرف چل دیا۔ اُجاگر سنگھ کچھ دیر یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا، پھر گویا اچانک جاگ پڑا۔ نکا عیسائی جانوروں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اور کبھی کبھار چور نظروں سے اُجاگر سنگھ کو بھی دیکھ لیتا تھا اور ساتھ دل ہی دل میں اپنی خیر مانگے جا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اوّل تو بڑے سردار صاحب کو غصہ ہی نہیں آتا اور اگر آ جائے تو پھر کسی کی بھی خیر نہیں ہوتی تھی خاص طور سے نکے کو تو سردار صاحب گالم گلوچ کے ساتھ ساتھ دھول دھپا بھی کر لیتے تھے۔ اور نکا عیسائی دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ سردار کی نظر کہیں اُس پر ہی نہ پڑ جائے اور جب سردار نے اسے آواز دی تو اُس کی تو جان ہی نکل گئی۔

''جی سردار جی'' نکا وہیں سے بولا۔

''اوئے کھوتے دیا کھرا! ادھر آ، وہیں سے جی جی کر رہا ہے۔''

سردار اُجاگر سنگھ بولا تو نکا بھاگ کے پاس آ گیا۔

''اوئے شمشیر کہاں ہے؟''

اور نکے کی وہیں جان نکل گئی۔ نکے نے شمشیر سنگھ کو دوپہر سے نہیں دیکھا تھا اور اُسے کیا خبر شمشیر کہاں ہے۔

''خبر نہیں سردار جی۔ گھر ہوگا''۔

''جا اُسے بلا کے لا۔ بھاگ کے جا''۔

''اچھا سردار جی۔'' اور نکاّ چل پڑا۔ پیچھے سے سردار صاحب نے پھر آواز ماری۔ ''اوئے بھتنی کے! اوئے نکّو! کدھر بھاگا جا رہا ہے؟''

''جی شمشیر سنگھ کو بلانے'' نکاّ آہستگی سے بولا۔

''اوئے نہیں پہلے تاجے نائی کو بلا کے لا۔ منٹ سیکنڈ میں آ۔''

''اچھا جی'' اور اب نکا سردار صاحب کے کسی اور حکم کے انتظار میں تھا۔

''اب جا بھی ماں کے خصم! میری طرف کیا دیکھے جا رہا ہے''۔ اور نکاّ انھی قدموں پر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ گالیاں تو روز کا کام تھا۔ اُس دن تو نکے نے شکر ادا کیا کہ قریب ہی جان بچ گئی، نہیں تو سردار اُجاگر سنگھ نام بگاڑنے اور گالیاں دینے میں پورے گاؤں میں اوّل نمبر تھا۔ لیکن اس وقت جب سردار صاحب نے نشہ پانی کیا ہو۔ نہیں تو سردار جی بات چیت ہی کم کرتے تھے۔

تاجا نائی حویلی میں داخل ہوا تو اُس نے کھنکار کے گلا صاف کیا اور سردار اُجاگر سنگھ اٹھ کے بیٹھ گئے۔

''صاحب سلامت سردار جی۔''

''صاحب سلامت! آ بھئی تاجے، آ''

اور تاجا نائی چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

''حکم سردار جی۔''

''وہ کیا بات تھی بھئی۔ چودھری حاکم خاں میرے ساتھ بات تو کر گیا ہے لیکن تو اپنی زبانی بتا۔'' سردار جی بولے۔

''بات تو کچھ بھی نہیں سردار جی! یوں ہی چودھری حاکم خاں آپ کے ساتھ یہ بات کر گیا ہے۔'' تاجا ہولے ہولے اُجاگر سنگھ کے گھٹنوں کے پاس کھسک آیا۔ اور چپکے سے کہنے لگا۔

''اوئے حاکم خاں کیوں نہ کرتا۔ آخر سجن ہے اور شمشیر جیسے میرا بیٹا ہے اُس کا بھی ہے، پر تو بات تو بتا۔'' سردار جی پیار سے بولے۔

''بات تو سردار جی قطعاً کوئی نہیں۔ وہ لڑکا اپنا شمشیر سنگھ نہیں تھا۔ کرتار سنگھ کا چھوٹا بیٹا راجندر تھا اور اپنا شمشیر اور راجندر قد کاٹھ میں ایک سے ہیں اور میں نے دُور ہی سے دیکھا تھا۔ گاؤں آ کے میں نے راجندر سے پوچھا تو کہنے لگا۔ ''بھئی وہ میں تھا''۔ اپنا شمشیر تو گائے ہے

---

۱ برساتی نالہ

گائے، سردار جی۔ ایسی اولاد تو رب ہر کسی کو دے''۔ تاجا ہولے ہولے کہتا جا رہا تھا۔ اور سردار اُجاگر سنگھ اپنی زیادہ تر سفید اور کم سیاہ داڑھی پر خوشی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، ''اوئے تاجیا! پر بات تو کر، تونے کیا دیکھا؟''

اور تاجا سوچتا تھا کہ سردار اُجاگر سنگھ بھی بادشاہ آدمی ہے۔ اتنا معصوم بندہ۔ اتنا سیدھا سادہ۔ نہیں تو جاٹ، وہ کیا کہاوت ہے۔ ''جاٹ سیدھا بھی ہو تو اُس میں جلیبی جتنے بل ہوتے ہیں''۔ اُجاگر سنگھ تو بھولا بادشاہ ہے۔ اُس نے بات شروع کی۔

''میں بسنتر[1] کے کنارے گھاس کھود رہا تھا تو پرے گنے کے کھیت کے کنارے کنارے رُوپو چلی آ رہی تھی اور اُس کے ساتھ''۔

''کون رُوپو؟''

''روپو، سردار کرتار سنگھ سندھو کی بیٹی۔ اور گاؤں میں کون رُوپو ہے سردار جی۔''

''اچھا''۔

''اور اس کے ساتھ راجندر سنگھ تھا جسے میں اپنا شمشیر سمجھا۔ اور وہ دونوں ہنس ہنس کے باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ بس''۔

''بس؟''

''ہاں جی''۔ تاجے نے بات ختم کر دی۔ اُس نے حاکم خاں کے کہنے پر زندگی میں پہلی بار سردار اُجاگر سنگھ کے ساتھ جھوٹ بولا تھا اور اگر وہ جھوٹ نہ بولتا تو شمشیر سنگھ کی خیر نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سردار اُجاگر سنگھ رندھاوا تو دریا تھا دریا۔ جس سمت بہنے لگا، بہنے لگا۔ پھر اُس کا راستہ پہاڑ بھی نہیں روک سکتا۔ بات زبان سے نکل جائے ایک بار، غلط ہو چاہے ٹھیک، وہ سانڈ کی مانند سینگ پھنسا کے ڈٹ جاتا۔ اور جہاں ڈٹ جاتا تھا وہاں چاہے مر جائے پیروں کی مٹی نہیں چھوڑتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُس میں سب سے بڑی صفت یہی تھی اور یہی سب سے بڑا عیب بھی۔ اسی وصف کے کارن اس نے نیک نامی کمائی اور اسی عیب کے طفیل اُس نے بڑے نقصانات اُٹھائے۔ اس سے بڑھ کر نقصان اور کیا ہو سکتا تھا کہ سندھوؤں جیسے وہ اپنے سجنوں کو گنوا بیٹھا۔ رندھاوے اور سندھو آپس میں یوں بھم ہوتے تھے جیسے ایک ہی ماں سے جنم لیا ہو اور نکھڑے تو یوں نکھڑے گویا دریا کے دو کنارے جو ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے بھی کبھی نہیں ملتے۔ اُجاگر سنگھ رندھاوا اور کرتار سنگھ سندھو جو روٹی بھی ایک دوجے کے بنا نہیں کھاتے تھے، اب ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔

شروع شروع میں تو لوگ کہتے تھے چلو کوئی بات نہیں۔ گھڑے کے پاس پڑا گھڑا آپس میں ٹکرا ہی جاتا ہے۔ پر یہ دو گھڑے تو ٹکرانے سے مڑے ہی نہیں۔ عمریں بیت گئیں لیکن یہ دشمنی کم نہیں ہوئی۔ بلکہ روز بڑھتی ہی چلی گئی۔ اُجاگر سنگھ یار بھی دانا تھا اور دشمن بھی دانا۔ شروع سے ہی اُس کی عادت رہی تھی کہ جس سے یاری ہے علی الاعلان اور جس کے ساتھ دشمنی ہے اس سے ڈنکے کی چوٹ پر۔ اور کسی کے ساتھ دوستی ہے تو کھلے بندوں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ منافقت سور ماؤں کا فعل نہیں ہے۔ تاجے نے جھوٹ بول کر شمشیر سنگھ کے سر آئی بلا بھی ٹال دی تھی۔ اور وہ جھوٹ کیوں نہ بولتا۔ حاکو کھرل کی بات نہ مان کر اُس نے گاؤں بدر ہونا تھا۔ حاکو کھرل اپنی جوانی میں جانا پہچانا ڈکیت تھا۔ بندہ قتل کر دینا تو اُس کے لیے یوں تھا جیسے کوئی کیڑا مکوڑا مار دینا۔ سارے گاؤں میں لے دے کے اُس کا بیٹھنا سردار اُجاگر سنگھ کے ساتھ تھا۔ اُس نے اور سردار اُجاگر سنگھ نے آپس میں پگڑیاں بدلی ہوئی تھیں۔ بیاہ شادی، مرن جیون پر۔ لڑائی جھگڑوں میں حاکو کھرل اور اُجاگر سنگھ کے گھر دو نہیں تھے۔

پھر اولاد کا بھی آپس میں گہرا سلوک تعلق تھا۔ جب کا اُجاگر سنگھ اور کرتار سنگھ کا آپس میں بیر پڑا تھا، حاکو کھرل نے کرتار سنگھ کے سارے گھرانے سے قطع تعلق کر لیا۔ اُس نے تو دربار صاحب کے میلے میں، جب کرتار سنگھ کے بیٹوں اور اُجاگر سنگھ کی لڑائی ہوئی تھی۔ بانہہ کھڑی کر کے کہا تھا ''کہ آج سے اُجاگر سنگھ کے دُشمن میرے دُشمن اور اُجاگر سنگھ کے سجن میرے سجن۔'' اور آج اُس بات کو سترہ برس گزر گئے تھے۔ لیکن حاکو کھرل نے ہر میدان میں اپنی بات کی لاج نبھائی تھی۔ آخر حاکو بھی سورما تھا اور جوانی کے چار دن اُس نے اور اُجاگر سنگھ نے اکٹھے بتائے تھے۔ تاجا نائی اُٹھا اور اجازت لے کر چلنے لگا تو سردار اُجاگر سنگھ بولا۔

''اوئے گھر کی طرف سے ہوتے جانا۔ روٹی کھاتے جانا۔ اور تو جا اب''۔

اور تاجا اُٹھ کے گھر کو چل پڑا۔

شمشیر سنگھ اپنی حویلی میں جثے پر تیل لگا کر سہا گا اٹھانے میں مصروف تھا کہ پھاٹک کھڑکا۔
''کون بھئی؟''
''اوئے دروازہ تو کھول، چن''۔ شمشیر سنگھ نے حاکو کھرل کی آواز پہچان لی۔
''آ چاچا! کہاں سے سویرے سویرے۔ اندر ڈھارے میں چلا جا۔ باہر تو ٹھنڈ ہے''۔ شمشیر کہنے لگا۔
''اوئے منڈیا! تو اندر ڈھارے میں تیل لگایا کر پوس ماگھ کے دنوں۔ ننگے جثے اتنی ٹھنڈ میں نہ پھرا کر۔ کہیں سردی نہ لگ جائے''۔
''نہیں چاچا، جیٹھ ہاڑھ ہو چاہے پوس ماگھ۔ فجر کے وقت تیل ملنا تو اپنا کام ہے۔ لیکن چھوڑ اس بات کو یہ بتا، سویرے سویرے فوجیں کدھر سے آئی ہیں؟''
''تجھ سے ایک بات کرنا ہے۔ بھائی تو گھر سوتا ہوگا؟ ہر بچن سنگھ کہاں ہے؟'' حاکو نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر دیے۔
''بھائی ہر بچن تو ابھی گھوڑے کو پھیرا لگوانے لے گیا ہے اور میں ایک تاری لگا آؤں تو پھر بات کرتے ہیں۔''
''اچھا اچھا۔ ہاں تو جلدی سے نہا کے آ۔ کنواں چل رہا ہے آج؟''

''نہیں چاچا کنواں نہیں چلتا۔ میں آپ ہی گیڑ کے اشنان کرآتا ہوں۔''

اور شمشیر کپڑا لے کر حویلی کے ساتھ والے کنویں پر نہانے چلا گیا، کچھ ہی دیر میں نہا کر وہ واپس آ گیا۔ کیس لپیٹ کر اس نے جوڑا کیا اور پگڑی سر پر لپیٹ کر حاکو کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاں چاچا! اب بات کر۔ خیریت تو ہے؟''

''ہاں خیریت ہے۔ لیکن ہر بچن سنگھ کے گھوڑے کی تیاری کیسی ہے؟ بابا حسن شاہ کا میلہ تو سر پر آ گیا ہے۔ رب سچا ہے جواب کی بار عزت رکھ لے تو۔ سنا ہے کرتار سنگھ نے بیٹے کو بار میں سے آٹھ سو کا گھوڑا لا کر دیا ہے، خاص اس میلے کے لیے۔''

''رب سچے سے سکھ مانگ چاچا۔ آپ کی دعائیں چاہییں اور نیلی چھت والے کی نظر کرم کی ضرورت ہے۔ اس سال ہر بچن کا گھوڑا بڑا تیار ہے۔ گھر کا جو دانہ دُنکا تھا وہ تو گھوڑے کو کھلا بیٹھا ہے۔ کرتار سنگھ جی، اگر اس بار بھی دوڑ میں پیچھے نہ رہ گئے تو میرا نام بدل دینا۔''

''بھئی بہت پیار ہے تیرے بھائی کا گھوڑے کے ساتھ۔ اور سارے ضلع میں اس کے برابر کا کوئی جانور بھی نہیں۔ جیتا رہے۔''

''پر چاچا۔ وہ بات کیا تھی۔؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''بات کیا تھی!'' حاکو سوچ کر کہنے لگا۔''بات یہ ہے شمشیر بیٹا! بھئی اپنے باپو کی عادت تم اچھی طرح جانتے ہو۔ سندھوؤں کے ساتھ دشمنی بھی تجھے بھولی نہیں ہوگی۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ دریا کے دو کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ آگے تو خود سمجھ دار ہے۔ میری بات ذہن میں بٹھا لے اور سوچ''۔

''بات ذرا کھل کے کر چاچا۔ کیا بجھارتیں بجھائے جا رہے ہو۔'' شمشیر کہنے لگا۔

''تجھے نہیں پتا۔ اوئے بیٹے اب تو اللہ رکھے دانا و بینا ہے۔ جوان ہے۔ جس گاؤں نہ جانا ہو اُس کا راستہ نہیں پوچھتے۔ اور پھر سوئی کلا کو جگانا بھی عقل مندی نہیں۔'' حاکم خاں آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

''چاچا! سونہہ گورو کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ جانے تو کیا کہتا ہے۔'' شمشیر سنگھ بڑی ہی معصومیت سے بولا۔

''اوئے شمشیر، تو اور روپو کل بستر کے کنارے۔''

''اکٹھے چلے آ رہے تھے۔ ہیں ناں''۔ شمشیر نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں''۔
''تجھے تاجے نائی نے بتایا ہوگا۔وہ پرے گھاس کھود رہا تھا۔ پر یہ بھی کوئی بات ہے؟''
''اوئے چناں! ہوش کر۔تو کہتا ہے یہ بھی کوئی بات ہے؟ بھائیا اُجاگر سنگھ تو یہ سن کر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوگیا تھا اور اگر یہ بات کرتار سنگھ یا رُوپو کے چھ بھائی سن لیں، جو سانڈوں کی طرح پلے ہوئے ہیں، تو پھر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ خون خرابہ!۔ حاصل کیا ہے ایسی چھوٹی باتوں پر خون خرابہ کرنے میں؟ تجھے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جس گاؤں نہ جانا ہو اُس کا راستہ نہیں پوچھتے ہیں''۔
''بھائیے کو کس نے بتایا؟'' شمشیر نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔''
''تو وہ بات چھوڑ، اُس کی تو میں نے تاجے سے ہی تسلی کروادی تھی کہ وہ شمشیر نہیں، روپو کا بھائی راجندر تھا۔ لیکن چن ایسی باتوں کا کوئی انت اخیر نہیں ہوتا۔ آج نہیں تو کل باہر نکل آئے گی۔ اور دونوں گھر اُجڑ جائیں گے۔ بیٹے چھوڑ اس بات کو۔'' حاکو نے اُسے سمجھایا۔
''چاچا میرا کوئی قصور نہیں، دھرم سے''۔
''اور کس کا قصور ہے؟''۔ حاکو کچھ تیز ہوگیا۔
''چاچا میری بات تو سن لے۔ میں اِتنا بچہ نہیں جتنا تو سمجھتا ہے۔''
''اوئے بچہ ہونے کی بات نہیں شمشیر سیاں۔ اس عمر میں بندے کے لہو میں آگ ہوتی ہے۔ اور اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنا نفع نقصان بھی نہیں سوچ سکتا۔''
''چاچا میری بات تو سن لے۔ اگر میرا قصور نکلے تو بے شک جو جی میں آئے مجھے سزا دینا''۔ شمشیر کہنے لگا۔
''تجھے پتا ہے نا کہ پچھلے پانچ چھ سالوں سے بابا حسن شاہ کے میلے پر گھوڑ دوڑ میں بھائی کا گھوڑا ہمیشہ جیت جاتا ہے۔ اور دوڑ پر اچھی خاصی دُشمنی بھی ہوجاتی ہے۔ اچھی خاصی کیا؟ یہ تو ہوتی ہی کرتار سنگھ کے بیٹوں اور ہمارے درمیان ہے۔ باہر کے تو ہوتے ہی ایک دو گھوڑے ہیں۔اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہر سال اس دوڑ پر کتنی شرطیں لگتی ہیں اور کرتار سنگھ کس قدر جان لڑا دیتا ہے لیکن واہگورو، ہر بار ہماری عزت رکھ لیتا ہے پچھلے برس تجھے یاد ہے کرتار سنگھ کا بیٹا راجندر سنگھ جب ہار گیا تھا تو اُس نے ہمیں للکارا تھا کہ اگلے برس اگر میں یہ دوڑ نہ جیتا تو گھوڑے پر چڑھنا چھوڑ دوں گا اور رندھاویو، تم بھی اپنا زور لگا لینا۔ یہ نہ کہنا کہ سندھوؤں نے بتایا نہیں تھا۔ اور اس سال وہ دوڑ ہونی

ہے۔''

''اوئے وہ بات کر جو تو کرنے لگا تھا۔ ان سب باتوں کا تو مجھے بھی علم ہے۔'' حاکو کھرل نے شمشیر سنگھ کی بات کاٹ کر کہا۔

''سن چاچا، صبر سے۔'' اور شمشیر سنگھ نے بات شروع کر دی: ''پھر تجھے چاچا یہ بھی پتا ہے نا کہ پچھلے تین چار مہینوں میں دو بار بندے ہمارا گھوڑا کھولنے آتے رہے ہیں پر بھائی جاگ پڑتا تھا۔ اگر سچ پوچھو تو بھائی حویلی میں سوتا ہی گھوڑے کے لیے ہے۔ اور رات ایک پل بھی اس سے غفلت نہیں برتتا۔ پچھلے مہینے کی بات ہے بھائی خالہ کے گاؤں گیا۔ وہاں ایک شادی تھی اور بھائی کو وہاں چار پانچ دِن لگ جانے تھے۔ گھوڑا کچھ ٹھیک نہ تھا تو بھائی اسے چھوڑ گھوڑی لے گیا۔ چلتے وقت اُس نے مجھ سے کہا۔ ''شمشیر گھوڑے کا ایک پل بھروسا نہ گنوانا۔ رات کو کوٹھڑی میں گھوڑا باندھنا اور دروازے کے آگے چار پائی بچھایا کرنا۔''

''بھائی چلا گیا اور گھوڑا میرے ذمے رہ گیا۔ دو راتیں تو سکون سے گزر گئیں۔ تیسری رات میں نے برآمدے میں چار پائی بچھا رکھی تھی۔ گیارہویں رات کا چاند تھا اور رات میں دیر سے سویا۔ پھر سائیں ماچھی کے کتے کے بھونکنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ رات ڈھل چکی تھی اور کتا زور زور سے بھونکتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کے دیوار سے باہر گلی میں جھانکا تو ایک بکل بند، بندے پر کتاّ بھونک رہا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کے اُسے ہٹا رہا تھا۔ آخر کار اس نے ایک بڑی اینٹ پکڑ کتےّ کے سر ماری تو کتاّ چاؤں چاؤں کرتا ہوا دور بھاگ گیا۔ وہ بندہ جلدی جلدی آگے نکل آیا۔ میں جلدی سے برآمدے کے اندھیرے میں ہوگیا۔ آنے والا ہماری ہی حویلی کے پھاٹک کے آگے آ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اُس نے چھلانگ مار کر حویلی کی دیوار پھلانگی اور اندر چلا آیا۔ اس نے منہ ڈھاٹے میں اور جسم سفید چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ درمیانے سے قد کا تھا۔ اُس نے حویلی میں آ کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور گھوڑے والی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ کوٹھی کے دروازے سامنے کھڑا ہو کے پھر اُس نے اردگرد نظر دوڑائی اور کوٹھی کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ وہ اندر داخل ہی ہونے لگا تھا کہ گھوڑے نے ہنہنا کر ساری حویلی سر پر اٹھا لی۔ میں نے پیچھے سے ہو کر اُسے جپھے میں لے لیا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے اُس نے پورا زور لگایا اور بکل سے ہاتھ نکال کر اس نے پیچھے کی طرف ہاتھ مارا۔ اُس کے اُس ہاتھ میں داتر تھا۔ میں نے اُس کی داتر والی بانہہ زور سے پکڑی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ داتر اُس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ میں تو اُس کی چیخ سن کے حیران

پریشان رہ گیا چاچا۔''

''کیوں''۔ حاکو بولا۔

''وہ چیخ مرد کی نہیں تھی، عورت کی تھی۔ اور میں اسے بازوؤں سے کھینچ کر حویلی کے صحن میں لے آیا۔ چاند کی روشنی نے دِن کر رکھا تھا۔ میں نے اُس کی بکل کھینچی تو پتا ہے چاچا وہ کون تھی؟'' شمشیر نے حاکو کی طرف دیکھا۔

''کون تھی؟'' حاکو کھرل جلدی سے پوچھنے لگا۔

''وہ روپو تھی کرتار سنگھ سندھو کی بیٹی۔''

''ہیں۔ روپو تھی وہ؟۔'' حاکو نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں چاچا وہ روپو تھی۔''

''پھر؟''

''پھر کیا! میں نے اُس کی دوہری کی ہوئی بانہہ چھوڑ دی اور اُسے چارپائی پر دھکا دے کر بٹھا دِیا۔ وہ تھکی ہوئی تیز تیز سانسیں لے رہی تھی۔

اُس کی بڑی بڑی آنکھیں غصے اور خوف سے پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اُس کے بکھرے بال چادر سر سے اُتر جانے کے باعث اوپر نیچے ہو کر اور بھی خوب صورت ہو چلے تھے۔ اور اُس کے ماتھے پر پوس کی اُس ٹھنڈی رات کو پسینہ چمک رہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی چاچا۔ پر میں نے جب اُسے ڈانٹ کے پوچھا۔''تم یہاں کیا لینے آئی تھیں؟'' تو وہ آہستگی سے روہانسی ہو کر بولی۔

''تمھارے گھوڑے کی ٹانگ کاٹنے۔''

''کیوں؟''

وہ خاموش تھی۔

''بتا تو سہی۔''

وہ پھر کچھ نہ بولی بلکہ نگاہ نیچی کیے بیٹھی رہی۔ جانے اُسے سردی لگ رہی تھی۔ اُس نے کس کر چادر کی بکل مار لی۔

''تو ہمارے گھوڑے کی ٹانگ کاٹنے کیوں آئی تھی؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ نہ تمھارا گھوڑا مقابلے میں بھاگے۔ نہ میرے بھائی کا

گھوڑا اس بار ہارے۔'' وہ تن کر کہنے لگی۔

''تجھے کس نے کہا؟''

''کسی نے بھی نہیں۔''

''تجھے خوف نہیں آیا!''

''نہیں!''

''تجھے اب بھی ڈر نہیں آتا۔''

''ڈر کس کا، میں کوئی تمھاری چور ہوں کہ تجھ سے ڈروں'' وہ اکڑ کر کہنے لگی۔

''جانتی ہو کہ سندھوؤں کی عزت اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ بتاؤ تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں؟''

''زبان سنبھال کے بات کر، بڑا سانڈ کہیں کا۔ اگر تو نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو سویرے میرے جوان بھائی تیرا قیمہ بنا ڈالیں گے۔ جانتے نہیں۔''

''جانتا ہوں تمھارے چھ جوان بھائیوں کو۔ اُن کے جسموں سے اگر میری چھوی کے نشان مٹ گئے ہیں تو اُن سے کہنا کہ ایک بار دوبارہ مجھے آزمالیں۔ میرا نام شمشیر سنگھ ہے۔ شمشیر سنگھ''۔ میں جوش میں آ گیا تھا کچھ۔

''وے جا، بڑا شمشیر سنگھ، لڑکی دیکھ کے اکڑ فوں دکھانے لگا ہے۔ سویر ہونے دے تجھے سب پتا چل جائے گا''۔ وہ بھی جوش میں آ گئی تھی۔

''دیکھو چور اور اوپر سے چتر۔ بڑی بڑھ بڑھ کے باتیں کرتی ہے۔ بی بی روپ کور، سویرے وہ جب تجھے ڈھونڈتے ہوں گے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھر آئیں گے اور آ کر اپنی بہن کے کرتوت دیکھیں گے اور پھر دنیا سنے گی تو اُس وقت اُن کی ساری چترائی نکل جائے گی۔ اور سردار کرتار سنگھ کی پگڑی کا شملہ تو خود بہ خود نیچا ہو جائے گا۔''

تو وہ رونے لگی۔

''مجھے جانے دو، تمھیں واہگورو کی قسم!''

یہی میں اُس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''چل اُٹھ تجھے گھر چھوڑ آؤں۔''

وہ اُٹھ بیٹھی ؛ میں نے اُس کا داتر پکڑ لیا اور گاؤں کے سب سے اوپر والی جانب جب اِن کا

گھر نزدیک آ گیا تو میں نے داتر اُس کو پکڑا دیا۔ اُس نے داتر پکڑ کے ایک بار میری طرف دیکھا اور جلدی جلدی گھر کو چل دی۔ میں حویلی واپس آ گیا۔ اُس کے بعد کل جب میں اوپر والے مربعے کی طرف پھیرا مار کے واپس آ رہا تھا تو راستے میں وہ بھی میرے ساتھ مل گئی۔ وہ ''کھوہ'' پر روٹی دے کر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑی اور میں نے اُس سے پوچھ لیا۔

''روپو، اب کب ہمارے گھوڑے کی ٹانگ کاٹنے آنا ہے؟'' تو وہ کھکھلا کے ہنس پڑی۔ میں اپنی حویلی کو لوٹ آیا اور وہ اپنے گھر کو چلی گئی۔ لے چاچا یہ تھی ساری بات۔ جسے تاجے کے بیٹے نے بڑا رنگ چڑھا کے باقاعدہ داستان بنا دیا ہے۔ اب تو ہی بتا اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' شمشیر نے اپنی صفائی پیش کی۔

''ٹھیک ہے! واقعی یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں! خیر اچھا! اب تو اپنا کام کر شمشیر بیٹے۔ اور سن ہربچن سے کہنا کہ اس بار چھے کوس کی دوڑ ہے۔ گھوڑے کا دم پکا لے۔ اور میں اب چلتا ہوں۔''

''چاچا یہ بات کسی سے بھی نہ کرنا نہ بھائی ہربچن سے نہ باپو سے۔'' شمشیر نے حاکو سے کہا،

''اچھا میری جان، میرے چن۔''

''تاکید ہے۔''

''اوئے، اچھا بھئی''۔ اور حاکو گھر کو چل دیا۔

بابے حسن شاہ کے میلے میں دو دن رہ گئے تھے۔ شمشیر سنگھ اپنی اونٹنی کو پانی پلا کے حویلی میں لے کر آ رہا تھا تو ہربچن سنگھ نے اُس کو آواز دی ''اوئے شمشیر یار!''

''ہاں بھائی۔''

''اوئے آج گھوڑا بھی نہلا دے کچھ میلا ہوگیا ہے۔ رات جانے کہاں بیٹھ گیا تھا، نیچے سے کافی لبڑ چکا ہے۔ گھر سے صابن لا اور پھر اس کے پیر، پچھل اور گردن خوب اچھی طرح سے دھونا۔''

''اچھا بھائی۔''

''تو یہ کام کر اور تمھاری جگہ جانوروں کو پانی میں پلاتا ہوں۔''

''نہیں بھائی، یہ کیا بات ہوئی۔ میں کوئی تھک تو نہیں جاؤں گا''۔ اور شمشیر سنگھ خوش تھا کہ بھائی نے آج اس سے کام کہا ہے اور وہ بھی گھوڑا نہلانے کا۔ ہربچن ویسے تو شمشیر سنگھ سے تین چار سال ہی بڑا تھا لیکن شمشیر کو اُس نے بیٹوں کی مانند رکھا تھا۔ زمین داری کا سارا کام ہربچن آپ ہی کرتا تھا اور شمشیر فارغ یا تو تیل لگا کے ڈنڈ بیٹھکیں نکالتا یا اپنے یار دوستوں کے ساتھ میلوں ٹھیلوں میں موج اُڑاتا پھرتا۔ بے بے یا باپو کبھی کہتے ''اوئے شمشیر تو اب جوان جہان ہے اپنے بھائی کے ساتھ کام کروایا کر۔''

اور ہربچن فوراً جواب دیتا ''نہیں بھائیا! شمشیر کی ابھی کون سی کام کرنے کی عمر ہے

اور پھر میں جو ہوں۔ اور پھر کام بھی اتنا کون سا ہے۔'' اور بے بے کہتی۔'' وے شمشیرا! واہگورو جی کو ایسے بھائی دے۔ دیکھ فجر سے لے کر رات گئے تک کس طرح کام کرتا ہے اور تجھے کبھی تنکا توڑ کے دوہرا نہیں کرنے دیا۔ واہگورو اس کی عمر طویل کرے۔''

اور بھائیا لاڈ سے کہتا'' اوئے شمشیر! کوٹھے جتنا ہو گیا ہے کبھی اپنے بھائی کا بھی ہاتھ بٹا دیا کر۔ سارا دن تیل لگالیا، دودھ گھی کھا لیا اور سہاگا اٹھالیا۔ اوئے لعنت ہے اس جوانی پر۔ میں جب تمھاری عمر کا تھا تو میں پانچ مربعے زمین کی واہی بیجی اکیلا کرتا تھا۔ اوئے رب کے بندے! جانوروں کو چارہ ہی ڈال دیا کر۔''

اور ہر بچن ایسے وقت پر کہتا'' بھائیا۔ کتنی بار کہا ہے کہ شمشیر سے کچھ نہ کہا کرو۔''

اور بھائیا جلدی سے کہتا:'' اوئے اچھا بھئی ہر بچن سنگھا۔''

اور ہر بچن سنگھ جیسا بیٹا بھی ماں کوئی کم ہی جنے گی۔ پہاڑ جتنا لمبا چوڑا جوان رب نے شکل اور عقل بھی اُسے جی بھر کے دی تھی۔ اور بھلا مانس اتنا کہ نزدیک کے پانچ چھ گاؤں میں اُس کے جوڑ کا کوئی گبھرو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کبھی کسی کے لیے دُکھ کا کارن نہیں بنتا تھا۔ گاؤں سے گزرتا لڑکیوں کی مانند نگاہیں نیچی کیے۔ اور گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے سے کہتیں۔

''اُجاگر سنگھ کے دونوں بیٹے شیر ہیں شیر، کیسی جوڑی ہے!۔ یہ بڑا لڑکا تو گائے ہے گائے۔ جوانی تو ہر کسی پر آتی ہے، پر اسے یوں سنبھالتا کوئی کوئی ہے۔''

اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس جیسی جوانی کسی پر کم ہی آئی ہو گی جب چلتا تھا تو زمین میں دھمک پڑتی تھی۔ پر نہ کوئی عیب نہ نشہ پانی۔ میلوں ٹھیلوں اور لڈی بھنگڑوں میں اگر یار بیلی دھکا زوری اُسے لے جائیں تو لے جائیں نہیں تو بس وہ یا اُس کا گھوڑا۔ اُسے بے حد شوق تھا گھوڑ دوڑ یا نیزہ بازی کا۔ اور دوڑ میں اُس کا گھوڑا سارے علاقے میں مانا ہوا تھا۔ لڑائی جھگڑوں سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ لیکن جب سر سے پانی گزر جاتا تو وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر لڑتا تھا۔ میدان سے بھاگتے ہوئے اُسے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور اُس کے سامنے کوئی سورما کبھی نہیں جما تھا۔ اُس کی ڈانگ کا وار سہ کے کھڑا رہنے والا سورما آج تک نہیں پیدا ہوا تھا۔ جتنا ہر بچن لڑائی جھگڑوں سے بچتا تھا۔ شمشیر سنگھ، اتنا ہی گرم طبیعت کا تھا۔ بالکل اپنے باپ کی مانند۔ چھوٹی چھوٹی بات پر بھڑک کر آپے سے باہر ہو جانا، چھوٹی چھوٹی بات پر دنگا فساد، لڑائی جھگڑے میں اُس کی رُوح بڑی خوش رہتی۔ اور ہر بچن ہمیشہ اُسے ٹوکتا رہتا اور کہتا'' اوئے شمشیریا! آگے گاؤں میں کون سی ہماری دشمنیاں کم ہیں

اور ہر جگہ لڑائی نہ مول لے لیا کر، زمانہ بڑا خراب ہے۔''

''گاؤں کے ویر دشمنیاں کیا ہوئیں بھائی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی میدان میں کرتار سنگھ کے بیٹوں کو دیکھوں۔ میری نظر میں وہ لڑکے جچتے ہی نہیں۔ بھیڑیں ہیں بھائی! بھیڑیں۔ کہیں اَب میرے ہاتھوں دیکھنا پورے ہی نہ ہو جائیں کسی روز۔''

''اوئے جا اوئے کام کر ایسی باتیں نہ کرتا رہا کر۔ دُشمن کو کبھی کم زور نہیں جاننا چاہیے۔ اور پھر وہ چھ بھائی اور ساتھ آٹھ دس ڈانگیں چاچوں بابوں کی اور ہم، صرف دو۔ رب سچے سے ڈرا کر اوئے لڑکے۔ جا، اُٹھ''۔

دراصل ہر بچن سنگھ شمشیر کو دیکھتا تو دِل ہی دِل میں نہال ہو جاتا۔ بھائی آخر بھائی ہوتے ہیں۔ اور پھر شمشیر جیسے بھائی۔ اور ہر بچن اُسے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا۔ ''جیتا رہے!'' وہ دِل ہی دِل میں کہتا۔

اور، اُس دن شمشیر سنگھ ہر بچن کے کہنے پر گھوڑے کو نہلانے بستر پر لے گیا۔ گاؤں سے نکل کے مڑھیوں سے گزرا تو آگے روپو روٹی لیے جاتی تھی۔ شمشیر اُس کے پاس جا کے جلدی سے کہنے لگا۔ ''او بچ جائیں کڑیے! گھوڑے کے نیچے نہ آ جائیں۔'' اور پھر وہ شرارت آمیز لہجے میں اپنے آپ کو جیسے کہنے لگا۔ ''یہ مُیاریں جانے راستہ چھوڑ کر کیوں نہیں چلتی ہیں۔'' اور روپو پیچھے کو منھ کر کے رُک گئی۔

''ہاؤ ہائے! اوئے! میں راستہ چھوڑ کے نہیں چلتی تو، تو نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے کہ راستہ خرید رکھا ہے۔'' وہ چھک کے کہنے لگی۔

''اوہ، اچھا روپو ہے؟''۔ شمشیر نے جھوٹی حیرانی سے کہا۔

''ہاں روپو ہے۔ پر بیگانے گھوڑے پر چڑھ کے تجھے کیوں کم دکھائی دینے لگا ہے۔ بیگانی دمڑی شاہوکار۔'' روپو، منھ ٹیڑھا کر کے نقل اتارتے ہوئے کہنے لگی۔ اور پھر یونہی چل پڑی۔

''روپو!'' شمشیر نے اُسے آہستہ سے آواز دی۔

''کیا کہنا ہے''۔ روپو نے چلتے چلتے مڑ کے دیکھ کر کہا۔ ''چلتے آؤ ناں۔''

''روپو؟''

''کیا ہے؟''

''پرسوں میلے پر جانا ہے؟۔''

''ہاں۔ پر میں نے تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ جانا ہے۔''
کیا کرو گی میلے میں جا کے؟''
''تجھے کیا؟ میں جا کر میلہ دیکھوں گی۔ سارے گاؤں کی عورتیں جائیں گی۔ پر تجھے کیا؟ تو اپنا راستہ ناپ!''

اور وہ چلی گئی۔ بستر آ گیا تھا اور شمشیر گھوڑے سے اُتر کے رُک گیا اور جہاں تک رو پو جاتے ہوئے نظر آتی رہی وہ اُسے دیکھتا رہا اور پھر گھوڑے کو لے کر بستر میں چلا گیا۔

اُس دِن بابے حسن شاہ کا میلہ تھا۔

وہ جگہ گاؤں سے یہی کوئی دو کوس دور تھی جہاں میلہ لگتا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد حاکو کھرل، اُجاگر سنگھ کی حویلی پر پہنچ گیا۔

''اوئے چلو بھئی منڈیو۔'' اُس نے آتے ہی آواز دی۔

ایسے موقعوں پر حاکو کھرل لڑکوں سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ ساتھ اُس کے چار بیٹے بھی تھے۔

''اوئے تم چلو لڑکو۔ ہم بعد میں آتے ہیں۔'' اور چاروں کھرل لڑکے گھوڑیاں موڑ کر میلے کو چل پڑے۔

''اوئے ہربچن سنگھ کہاں ہے؟'' حاکو نے شمشیر سے پوچھا۔

''گھر گیا ہے کپڑے پہننے، چلا ہی آرہا ہوگا''

''اوئے تو بھی کپڑے پہن لے نا، بچّے۔'' سردار اُجاگر سنگھ بولا۔

''بھائیا! جانوروں کو چارہ وغیرہ ڈال دوں تو پھر چلا آرہا ہوں۔ آپ چلیں۔''

ہربچن سنگھ، گھر سے رخصت ہونے لگا تو بے بے کہنے لگی ''وے، بیٹا ہربچن بات سن۔''

---

[1] جلدی جلدی نہا کر

''کیا ہے بے بے؟''

''شمشیر کا خیال رکھنا، لڑائی جھگڑا نہ کرلے'' اور بے بے نے توے کی پُشت پر اُنگلی لگا کے ہربچن کے ماتھے پر تھوڑی سی کالک لگا دی۔ ''میرے بیٹے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔'' اور ہربچن ہنس پڑا۔

ہربچن کی نئی لٹھے کی چادر کھڑ کھڑ کر رہی تھی۔ بوسکی کا نیا کُرتا اور مایہ لگی کیسری پگڑی جس کا ابرق لشکارے مار رہا تھا اور گلے میں کنٹھا۔ ہاتھ کی چھوی، گردن میں سونے کے کنٹھے سے زیادہ لشک رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام۔ بگا گھوڑا دُودھ سے زیادہ سفید نظر آتا تھا۔ خوب صورت رہنے والی کاٹھی اور دوہری باگوں والی لگام۔ ہربچن پہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ حویلی میں داخل ہوا تو حاکو کھرل بول اُٹھا''۔ بلے بلے، رب کی خیریں میرے بیٹے کو۔ اُجاگر سنگھ تیرا یہ بیٹا، ہیرا ہے، ہیرا''۔

سبھی لوگ تیار ہو کر چلنے لگے تو شمشیر سنگھ ابھی اپنی اُونٹنی کو پانی پلا رہا تھا۔

''اوئے چل بھئی تو بڑا سُست ہے۔'' اُجاگر سنگھ کہنے لگا۔

''نہیں بھائیا وہ بعد میں آئے گا اپنے یاروں کے ساتھ۔ تو گھوڑی پر آئے گا یا ڈاچی پر شمشیریا۔'' ہربچن کہنے لگا۔

''ڈاچی پر''۔ پر چلیں آپ۔ دھوپ چڑھتی آرہی ہے۔''

''چلو بھئی'' حاکو اُٹھ کر گھوڑی پر چڑھا۔ اُجاگر سنگھ کے ساتھ حاکو کے پانچ چھ یار اور تھے جو کہیں دُور پار کے دیہاتوں سے آئے تھے۔ سب سے بعد میں ہربچن سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا۔ گھوڑا سیخ پا ہو گیا اور ہربچن نے اُسے پیار سے تھپکی دی ''نہیں پتر اوئے'' اور گھوڑا ٹِک گیا۔

''شمشیر سنگھا! اپنے یاروں کے ساتھ آنا، اکیلا نہ میلے میں پھرنا۔ ہمیں آن ملنا۔''

''اچھا بھائی۔'' شمشیر کہنے لگا اور ہربچن نے گھوڑا موڑ لیا۔

شمشیر سنگھ نہانے چلا ہی تھا کہ اندر سنگھ اور دینا ورک چلے آئے۔ ''اوئے آؤ بھئی، بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے''۔ شمشیر کہنے لگا۔

اندر سنگھ اور دینا گھوڑوں سے اُترے تو اندر سنگھ کہنے لگا ''بھائی اور چاچا کہاں ہیں؟''

''وہ تو چلے گئے ہیں تھوڑی دیر پہلے۔ تم بیٹھ جاؤ اور میں ذرا تاری لا کے کپڑے پہن لوں ۔''

اندر سنگھ اور دین محمد نزدیکی گاؤں کے وِرک تھے۔ شمشیر کے ساتھ اکٹھے کبڈی کھیلتے تھے اور ''پینا'' بھی اکٹھا ہی تھا۔ اور شمشیر کے بڑے گہرے یار تھے۔ اور جوان بھی غضب کے بڑے طاقت اور حوصلے والے تھے۔ آخر ورک تھے حوصلے والے کیوں نہ ہوتے۔ شمشیر سنگھ کپڑے پہن کے آ گیا اور اندر سنگھ نے چادر کی ڈب سے بوتل نکالی اور شمشیر سنگھ سے آنکھ مار کے کہنے لگا۔

''نشہ پانی بھئی۔''

''نہیں یار پچھلی بار یوں ہی زیادہ پی لی تھی، میلے میں لڑائی ہوگئی اور مجھ سے ایک ڈانگ بھی کام کی نہیں ماری گئی تھی۔ میں نہیں پیتا، تم شغل کرو۔ اوئے پر مجھے گلاس تو لا نے دو، دوڑ کے۔''

''گلاس کیا کرنے ہیں برادر بوتل کو منھ لگا کے پیو تھوڑی سی۔ لڑائی کو بھی دیکھ لیں گے۔ دینے نے رات کو ہی نکالی ہے۔ اور چیز بھی بڑی تیز ہے۔ منٹ سیکنڈ میں نشہ کرتی ہے۔''

اور شمشیر نے بوتل نکال کے منھ سے لگا لی۔ آدھی ختم کر کے اُس نے دین محمد کو دے دی اور بچی کھچی اندر اور دین محمد نے پی لی۔

''چلو۔'' خالی بوتل کو توڑی کے موصل میں رکھ کے شمشیر کہنے لگا۔

''چلو بھئی۔'' اور وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تو نے کس پر جانا ہے؟'' اندر سنگھ نے شمشیر کو پوچھا۔ ''ڈاچی پر۔''

اوئے نہیں یار، ہم دونوں گھوڑیوں پر اور تم ڈاچی پر۔

''مزہ نہیں آئے گا۔'' دین محمد کہنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کے کہتا ہے۔

''اک گھوڑی پر ہم دونوں چڑھ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے ناں۔''

''اچھا''۔ شمشیر نے گھوڑی کھول لی۔ پگڑیوں کے اُوپر اُنھوں نے کس کر رومال باندھ لیے اور گھوڑیوں پر چڑھ بیٹھے۔ گاؤں سے نکل کے اندر نے شمشیر کو آنکھ ماری اور شمشیر نے کرپان باگوں والے ہاتھ میں پکڑ کے چادر دُرست کی اور کہنے لگا، ''چلو بھئی۔''

اور انھوں نے گھوڑیوں کو ایڑیاں لگا دیں۔ گاؤں سے لے کر میلے تک کا راستہ رنگ بہ رنگ دوپٹوں اور پگڑیوں کی قوسِ قزح سے رنگا ہوا تھا۔ بچے، عورتیں، گھبرو اور بوڑھے ہنستے چہکتے میلے کو چلے جا رہے تھے۔ اس میلے پر بڑی خلقت آتی تھی۔ ایک تو یہ میلہ اب صرف ایک دن کے لیے لگتا

---

[۱] یہ اشعار پنجاب کی مشہور لوک داستان ''مرزا صاحباں'' سے متعلق ہیں۔ جس کو ڈھاڈی (راگی) ساز کے ساتھ پُر درد اور پُر تاثیر انداز میں گاتے ہیں اور سننے والوں پر جادو طاری کر دیتے۔

تھا اور دوسرا دربار صاحب والا گردوارہ بھی ساتھ ہی تھا۔ وہاں ماتھا ٹیکنے کے لیے بھی لوگ جاتے تھے۔ وہی بات تھی کہ ساتھ دیوی کے درشن اور ساتھ ہی لعلوں کا بیوپار بھی۔ اسی لیے اس میلے پر بہت دُنیا آتی تھی۔ پھر یہی ایک میلہ ایسا تھا جہاں گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی اور دوڑ بھی پھر رندھاوں اور سندھوؤں کی۔ بہت سے لوگ تو بس یہی تماشا دیکھنے چلے آتے تھے۔

شمشیر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے میلے سے دو چار ایکڑ پیچھے ہی گھوڑیاں روک لیں اور اندر سنگھ کہنے لگا، ''لے بھئی اب گھوڑیوں کو قدم قدم لے کر چلو، ذرا پسینہ خشک ہو جائے۔''

شمشیر سنگھ اچھا خاصا نشے میں تھا کہنے لگا، ''اوئے اندرا! سردیوں میں دو کوس بھاگ کے جس گھوڑی کو پسینہ آجائے لعنت ہے اُس گھوڑی کے۔''

اور وہ سب ہنس پڑے۔ میلے میں داخل ہوتے ہی ایک گائیک کا اکھاڑا لگا ہوا تھا۔ شمشیر سنگھ نے پگڑی درست کر کے گھوڑی روک لی۔ ''لے بھئی مرزے کے دو بول سن لو اندر سنگھا'' اور انھوں نے گھوڑیاں آگے کر دیں۔ گائیک آنکھیں بند کر کے گانے لگا تھا چمٹے کے ساتھ۔

''جنڈ جنڈ ولا بار داجٹا، کلر وچ نشان [1]
توں بکی بدھی نال جنڈ دے، آپے ستّوں دوشالہ تان
تیرے وہی چلا وندے کا نیاں تیری موت نہ دیوے جان''۔

(''اس پوری بنجر اور کلر زدہ زمین کا نشان جنڈ کا ایک درخت ہی ہے۔ جس کے ساتھ تو نے اپنی گھوڑی باندھی ہے اور آپ تو دوشالہ تان کے بے خوف سویا پڑا ہے تیرے فرشتے تیر برساتے آرہے ہیں، اور تیری موت تجھے یہاں سے جانے نہیں دے رہی ہے'')۔

اور شمشیر سنگھ نے اندر سنگھ کو آنکھ مار کر کہا:

''خوب گاتا ہے''۔

''ہاں۔''

''دو پل اور ٹھہر جائیں۔'' دینا کہنے لگا۔

---

[1] یہ اشعار پنجاب کی مشہور لوک داستان ''مرزا صاحباں'' سے متعلق ہیں۔ جس کو ڈھاڈی (راگی) ساز کے ساتھ پُر درد اور پُر تاثیر انداز میں گاتے ہیں اور سننے والوں پر جادو طاری کر دیتے ہیں۔

[2] دانا باد۔ مرزے کا گاؤں ہے۔ صاحباں اپنے والدین کے گھر سے نکل کر تو مرزے سے بہت جلد دانا باد، پہنچنے کے لیے کہتی ہے۔

اور راگی بڑے جوش سے گانے لگا تھا۔ جوڑی اور سارنگی کے ساتھ اُس کی آواز بہت ہم آہنگ تھی۔ اور اُس نے ایک بار آنکھ کھول کے دیکھا تو اُسے سردار شمشیر سنگھ نظر آیا، اُس نے گاتے گاتے چمٹے والے ہاتھ سے شمشیر سنگھ کو سلام کیا اور زیادہ جوش اور جذبے سے گانے لگا۔

''بھور پُھلاں دی دوستی، جیہڑی لگی رنگ محل[1]
پھل سکے، بھور اُڈ گئے، پچھے رہی نمانی ول
وے تینوں واسطہ پاونی آں پیردا، جٹا دانا بادنوں چل''

(بھنورے اور پھولوں کی دوستی جو رنگ محل میں شروع ہوئی! پھول سوکھ گئے تو بھنورے بھی اُڑ گئے۔ پیچھے لے دے کے بیچاری بیل رہ گئی۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں مرزے، تو[2] دانا باد کی طرف چل پڑ۔''

''واہ بھئی واہ''۔ اندر سنگھ کہنے لگا۔

''بھئی کیا آواز ہے۔'' دینا بولا۔

''سُکھ اوئے سوہنے'' اور شمشیر سنگھ نے اپنی چادر کی تہہ سے دس کا نوٹ نکال کے بازو کھڑا کیا۔ تو راگی نے نوٹ پکڑ کے ویل گانا شروع کی۔

''ویل ویل
دس روپوں کی ویل
سردار شمشیر کے ہاتھوں سے ویل
رندھاووں بادشاہوں کی ویل''

وہ ویل پکارتا اور مجمع مڑ مڑ کے دیکھتا رہ گیا۔ شمشیر سنگھ، لوگ جانے کہاں کے کہاں پہنچ گئے تھے۔

شمشیر سنگھ نے کرپان باگ والے ہاتھ میں پکڑ کے دایاں ہاتھ کان پر دھرا اور سُر لگائی۔''اوئے جٹا دانا بادنوں چل۔''

آس پاس پھرنے والے لوگ مڑ مڑ کے دیکھنے لگ گئے۔

''شمشیر سنگھ ہے۔''

''اوئے رندھایوں کا لڑکا ہے۔''

''زیادہ پی ہوئی ہے۔ لگتا ہے۔''

اور نہ جانے کیا کیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور میلے میں آنے والا کون سا ایسا بندہ تھا جو اُسے نہ جانتا ہو۔ اور وہ مست ہوئے گھوڑیوں کو بے لگام لیے جا رہے تھے۔

''گھوڑیوں سے اُتر پڑیں اب، بھیڑ بہت ہے۔'' اندر سنگھ کہنے لگا۔

''اوئے دانا بادنوں چل'' شمشیر سنگھ نے اندر سنگھ کو آنکھ ماری۔

''رات کو چلیں گے'' وہ آگے سے بول پڑا۔ شمشیر سنگھ نے ایک مٹھائی والی دکان کے سامنے گھوڑی کھڑی کر دی۔ ''اوئے جلیبی کیا بھاؤ ہے''۔ شمشیر پوچھنے لگا۔

''روپے سیر سردار جی۔''

دو سیر دے دو، لیکن گرم ہوں۔''

اور اُس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے دُوکان والے کو دیا۔

''پیسے رہنے دیں، سردار جی۔'' دوکان والا کہنے لگا۔

''اوئے نہیں اوئے''۔ اور وہ جلیبیاں پکڑ کے چل پڑے۔

''باقی پیسے تو لے جاؤ سردار جی۔'' پیچھے سے دوکان والے نے آواز دی۔

''اوئے اگلے برس لے لیں گے۔'' شمشیر سنگھ نے مڑ کے کہا۔

اور ایک آم کے درخت کے نیچے اُتر گئے۔

''لو بھئی ورکو کھاؤ مٹھائی۔'' اور شمشیر سنگھ پھر گانے لگا۔

''اوئے چھوڑ شمشیر سنگھا۔ مرزا بھی کوئی سورما تھا'' اندر سنگھ کہنے لگا۔ ''اگر اُس کے پیچھے سے یہی کرتوت تھے تو اُس نے صاحباں کو نکالا ہی کیوں تھا''۔

شمشیر چڑ گیا۔ ''اوئے اندرا، تجھے کیا پتا ہے۔ مرزا بہادر آدمی تھا۔ بھرے پُرے گاؤں سے عورت بھگا کے لے گیا تھا۔ اُسے تو مارا تقدیر نے۔ صاحباں کے بھائیوں سے وہ مرنے والا ہرگز نہیں تھا''۔ جلیبیاں کھا کر دین محمد کا نشہ بھی سوا ہوا، وہ کہنے لگا۔ ''اوئے شمشیر سنگھا! صاحباں رَن بڑی ہوگی۔''

''ہاں'' اور شمشیر سنگھ ایک جلیبی پکڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کدھر'' اندر سنگھ نے پوچھا۔

''اپنی صاحباں سے ملنے۔''

''اوئے کون صاحباں شمشیر سنگھا؟ کہیں خاموشی سے ہی ہاتھ مار لیا ہے تو نے۔'' اندر سنگھ کہنے لگا۔

''ہاتھ ابھی مارا نہیں، مارنا ہے''۔ شمشیر سنگھ، اندر کو آنکھ مار کے کہنے لگا۔

''اوئے اپنی کرپان تو لیے جا۔ اور جلدی لوٹ آنا۔ کوئی خطرے کی بات ہے تو ہم بھی چلیں ساتھ۔''

''اوئے نہیں اندرا، تم یہیں میرا انتظار کرو اور میں پل بھر میں آیا'' شمشیر سنگھ چٹکی بجا کر کہنے لگا۔

شمشیر سنگھ میلے میں یوں گھوم رہا تھا جیسے باڑے میں اتھرا بیل۔ وہ باغ کی طرف جا نہیں سکتا تھا۔ وہاں اُس کا باپ اور دوسرے سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور اگر وہ وہاں چلا جاتا تو پھر وہ اُسے اکیلے نکلنے نہیں دیتے۔ پر باغ میں روپو ہونی بھی کہاں تھی۔ وہاں تو لوگوں کا ہجوم کثیر موجود تھا۔ شمشیر نے سوچا۔ ممکن ہے وہ خانقاہ والی ٹاہلیوں کے نیچے ہو۔ اور وہ خانقاہ کی جانب چل دیا۔ خانقا، پر عورتیں چڑھاوے چڑھا رہی تھیں، منتیں اُتار رہی تھیں۔ اور کچھ دور پرے ٹاہلیوں کے نیچے بیٹھی تھیں۔ روپو کی ماں، چچی اور سبھی گاؤں کی عورتیں وہیں بیٹھی تھیں۔ لیکن روپو وہاں نظر نہیں آتی تھی۔

''ممکن ہے وہ آئی نہ ہو۔'' اور اُس نے دِل کی یہ بات مان لی۔ اور یہ سوچ کے شاید اُسے پیاس لگ گئی تھی اور وہ کنویں کی جانب پانی پینے چل پڑا۔ ایک کنواں باغ میں تھا۔ اور وہاں اُس کو جانا ہی نہیں تھا۔ اور دُوسرا کنواں خانقاہ سے تین چار ایکڑ دور میلے سے باہر کی جانب تھا۔ وہ اُس کنویں کی جانب چل دیا۔ کنویں کے قریب پہنچا تو پیچھے ہی ٹھہر گیا۔ اُس نے آس پاس دیکھا اور کوئی بندہ، پرندہ وہاں نزدیک نہیں تھا اور کنویں پر روپو کھڑی تھی۔ شمشیر سنگھ کنویں کی دِیوار کی اُوٹ میں چلا گیا۔ روپو، گادھی کے پاس کھڑی ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کے میلے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ سفید شلوار قمیص اور اوپر کیسری دوپٹہ، اس کا بدن اس کے کُرتے سے باہر نکلا جا رہا تھا۔ اُس کی موٹی موٹی حسین بھوری آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا اُس کا میلے میں کچھ کھو گیا ہو۔ اور پھر وہ گادھی پر بیٹھ کے آہستہ آہستہ کچھ گانے لگی۔ شمشیر نے کانوں سے پگڑی اُوپر کھسکائی اور سُنا۔

''چناں وے تینوں یاد کراں

چرخے دے گن گن پھیرے''

اور، وہ کچھ اور نہ سن سکا۔ وہ پرے ہو کے کھنکارا۔ اور روپو خوف زدہ ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر شمشیر کی طرف دیکھ کے اُس کا چہرہ لال سُرخ ہوگیا۔ اور پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''روپو چرخہ کہاں ہے؟'' شمشیر نے پوچھا!

''کون سا چرخہ؟'' اُس نے شمشیر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''جس کے پھیرے گن رہی تھی؟''

''اچھا وہ! اور تو یہاں چھپ کے کھڑا تھا۔ اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو پھر؟''

''پھر کیا ہے؟۔ کوئی چوری ہے۔''

''ہاں۔''

''کس کی اُڈیک میں تھی، روپو؟''

''تجھے کیا؟'' وہ چڑ گئی۔

''پھر بھی؟''

''اپنی ایک سہیلی کی! پر تو کیوں پوچھتا ہے۔ اور تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔ تو بھی......''

''نہیں'' شمشیر نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

''پھر کیا لینے؟'' روپو نے پوچھا!

''میری گائے گواچ گئی ہے۔ میں اُسے دیکھنے آیا تھا''۔ اور وہ ہنس پڑا۔

''ٹٹ پینا'' روپو پیار سے کہنے لگی۔

''گالیاں کیوں دیتی ہے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے''۔ شمشیر مسکین بن کر کہنے لگا۔

''ہاہائے! وے اندھے یہ کوئی گالی ہے؟''

''ہاں۔''

''چل اب نہیں نکالتی۔''

''قسم کھا''

''دھرم سے''

''اور بڑی قسم کھا۔ یہ کوئی قسم ہے۔''

''سونہہ گورو دی۔ (قسم گورو کی) بس؟'' روپو بڑی معصوم لگ رہی تھی۔

''اور بڑی''۔

''اچھا بھئی۔ اور بڑی، اور بڑی'' وہ سوچ سوچ کے کہنے لگی۔ ''قسم بھائیے کی، بس اور؟''
وہ بچوں کی طرح بڑی معصوم اور میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔

''یہ قسم میں نہیں مانتا۔ کوئی اور قسم دے۔''

اور روپو غصّے سے سرخ ہوگئی اور چمک کے کہنے لگی۔ ''وے جا۔ آیا ہے بڑا تھانے دار۔
میں کوئی تیری چور ہوں کہ قسم کھاؤں۔ جاؤ نہیں کھاتی، تو بگاڑ لے میرا جو بگاڑنا ہے۔''

اور وہ جا کے کنویں کی گادھی پر بیٹھ گئی۔ منہ پھیر کے۔

''غصے ہوگئی ہو روپو؟''

روپو خاموش رہی۔

''بولتی نہیں۔''

''ہاں۔ ہاں غصّے ہوگئی ہوں۔ تجھے کیا؟''

''کوئی معافی کی صورت نہیں ہوسکتی روپو''۔

''کیا کہا ہے؟'' روپو، اُٹھ کے شمشیر کے پاس آ گئی۔

''معافی بخش دے'' اس نے عاجز سا بن کر کہا۔

''واہ وے شمشیریا۔ تو، تو بڑا ہی ڈرا کل ہے۔ اتنا گبھرو ہو کر لڑکی سے معافی مانگنے لگا''
روپو خوش ہوگئی۔

''لے، تو اب اپنی گائے ڈھونڈ لے اور میں چلتی ہوں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ بے بے
انتظار کرتی ہوگی۔'' روپو چلنے لگی۔

''اور اگر بے بے یہاں آ جائے تو؟''

''تو پھر کیا ہے میں کوئی چوری کر رہی ہوں یہاں۔ میں تو پانی پینے آئی تھی۔ بے بے
نے کیا کہنا ہے۔''

''اور، اگر وہ مجھے یہاں دیکھ لے؟''

''تو پھر کیا ہے۔ یہ کنواں کوئی ہمارا ہے''۔ روپو نے کہا۔

''شام، گھوڑ دوڑ نہیں دیکھنی؟''

''نہیں، ہمیں دربار صاحب ماتھا ٹیکنے جانا ہے اور وہیں سے ہم نے گاؤں مڑ جانا ہے۔ ہمیں بھائیے نے روک دیا تھا کہ دوڑ نہ دیکھنے آنا۔''

اور وہ چل پڑی۔ مڑتے ہوئے کہنے لگی۔ ''وے اگر گائے مل جائے تو اُسے پھر اکیلے مت چھوڑنا۔ اگر کھو گئی تو پھر نہیں ملے گی۔''

''کیوں؟'' شمشیر کہنے لگا۔

''اندھے'' کھو جانے والی چیزیں بار بار نہیں ملتیں۔ سُنا ہے۔''

''ہاں'' اور شمشیر روپو کی اس بات کو سوچنے لگا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ اور وہ بھی اُٹھ کر دوسری راہ سے چل دیا۔

اندر سنگھ نے شمشیر سنگھ کو آواز دی اور شمشیر سنگھ ٹھہر گیا۔ ''یار، تو کہاں کھو گیا تھا۔'' اندر سنگھ نے شکایتی انداز میں کہا۔

''اوئے میں گانے سننے لگ گیا تھا۔ لیکن گھوڑیاں کہاں ہیں؟''

''اچھا انسان ہے بھئی تو۔ وہ تیرا انتظار کر کر کے بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' اندر سنگھ اسے بازو سے پکڑ کے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔

''کدھر۔ پر وہ ہیں کہاں؟''

''باغ میں۔ دینا بھی اُن کے ساتھ ہی ہے۔ نیزہ بازی ہونے لگی ہے۔''

''اب۔''

''ہاں۔ سہ پہر کو تو پھر دوڑ ہونا ہے۔ اتنی دیر میں گھوڑے تازہ دم ہو جائیں گے۔ اگر تم سچ پوچھو تو میں کہتا ہوں، بھائی ہر بچن نہ کھیلے۔''

''کیوں؟'' شمشیر رُک گیا۔

''اوئے گھوڑا تھک جائے گا شمشیر سیاں۔ شام کو چھ کوس کی دوڑ ہے۔ مذاق نہیں۔''

''دل چھوٹا نہ کر اندرا۔ بھائی نے گھوڑے کو تین بھینسوں کا مکھن کھلایا ہوا ہے۔ چھ کوس کیا وہ گھوڑا تو چھ سو کوس بھاگ کر بھی نہیں تھکتا۔''

''پر، جانور تو سندھوؤں کا بھی ستھرا ہے، سُنا ہے آٹھ سو کا بار سے خرید کے لائے ہیں، مجھے تو ڈر ہے کہیں......''

''منھ سے بُری بات نہ نکال۔ رب سچے کے رنگ دیکھ، آج پتا ہے شرط کیا ہے؟'' شمشیر اندر سنگھ کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

''کیا ہے!''

''راجندرے نے کہا ہے اگر میں اس بار دوڑ ہار گیا تو پھر میں گھوڑے پر چڑھنا چھوڑ دوں گا۔''

''سچ؟''

''ہاں!''

''بھئی لُطف آ گیا شمشیر سیاں، پر صحیح لُطف تو تب آئے گا جب شام کو نُقرہ دوڑ جیت جائے گا۔'' اندر لہک کر کہنے لگا۔

''اندرا!'' شمشیر نے چلتے ہوئے کہا۔'' کوئی کبڈی شبڈی کا رُخ بنتا ہے یا نہیں؟ یار کہیں بدن ہی کھول لیتے؟''

''اوئے نہیں۔ کرتار سنگھ نے لڑکوں کو پکی کر دی ہے۔''

''کہ بھئی کبڈی نہ کھیلیں''۔ شمشیر نے پھر اُس کی بات پر بات کر دی۔

''ہاں''

''کیوں؟''

''جھگڑا ہو جائے گا۔''

''کرتار سنگھ جھگڑے سے ڈرتا ہے؟''

''ہاں۔ ڈرے کیوں نہ؟ وہ کوئی مورکھ ہے؟ اُسے پتا ہے کہ رندھاووں کے ساتھ ورکوں اور کھرلوں کی ڈانگیں بھی ہیں۔ رندھاوے اکیلے نہیں۔''

''پرائی واہر نہیں لڑتی۔ واہگورو کی نظر کرم چاہیے۔ ہمیں اپنی ڈانگوں پر مان ہے''۔

''جیویں، اوئے شیرا''۔ اندر سنگھ خوش ہو کر کہنے لگا۔'' تیری یہی تو ادائیں ہیں جس کے کارن ہم تیرے مرید ہو گئے ہیں۔''

شمشیر سنگھ ہنس پڑا۔ اور اندر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ شمشیر کے کان کے

قریب منہ لے جا کر کہنے لگا۔

''اُسے مل آیا ہے؟''

''کسے؟''

''اوئے اپنی صاحباں کو۔''

''ہاں'' اور شمشیر ہنس پڑا ''سونہہ گورو دی، اندر سیاں، بڑی عورت ہے۔''

''وہ، ہے کون؟''

''یہ ابھی نہ پوچھ۔ پر تیری قسم! اندرا اتنے بڑے دِل گُردے والی عورت میں نے نہیں دیکھی کبھی۔'' شمشیر سنگھ، ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگا۔

''پر وہ ہے کون؟۔ ہمیں اپنی بھابی دِکھلا تو دے شمشیر سیاں۔''

''دیکھنی ہے؟''

''ہاں۔''

''آج شام سہی، پر تو نے اُسے کیا دیکھنا ہے۔ وہ تو بندے کو دیکھ کر اُس کا دِل نکال لیتی ہے۔ اچھا، تجھے دِکھا ہی دیں گے۔ آخر تیری بھابی ہے''۔ شمشیر سنگھ خوشی سے نہال ہو کر کہنے لگا۔

''کہاں؟''

''دربار صاحب والے گردوارے، شام کو۔''

''اچھا'' اور اندر سنگھ جلدی سے میدان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے نیزہ بازی شروع ہو چکی ہے، جلدی چلو۔''

''اچھا'' شمشیر اور اندر سنگھ بڑے بڑے ڈگ بھرنے لگے۔

نیزہ بازی ابھی شروع نہیں تھی ہوئی۔ میدان لگ گیا تھا اور دوڑنے والے گھوڑے میدان میں نکل آئے تھے۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ یوں لگتا تھا گویا سارے کا سارا میلہ اس طرف اُمڈ پڑا ہو۔ خلقت ہی خلقت تھی چار سو۔ پیدل، گھوڑیاں، ڈاچیاں سارا میدان رنگ برنگی پگڑیوں سے لشک رہا تھا۔ فوجا ڈیرے والا اور حاکو کھرل منصف تھے۔ دونوں اپنے اپنے زمانے کے جانے مانے نیزہ باز اور گھڑ سوار تھے۔ بھاگنے والے سات گھوڑے تھے۔ اک ہر بچن سنگھ دوسرا احمد کھرل (حاکو کا بڑا بیٹا)، تیسرا راجندر سنگھ (کرتار سنگھ کا بیٹا) اور چار گھوڑے راوی پار سے تھے۔

فوجا سنگھ نے ڈنگوری پر صافہ باندھا اور دونوں باہیں کھڑی کر کے خلقت کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر وہ منھ کے گرد دونوں ہاتھوں سے گھگھو بنا کے اونچی آواز سے کہنے لگا۔

''لو، بھئی بھائیو، باہر سے کوئی بندہ دخل نہ دے اور نہ کوئی چھیڑ اور لگاوٹ کی بات ہی کرے۔''

اور نیزہ بازی شروع ہوگئی۔ چار میدان دوڑ ہوئی اور میدان میں صرف دو ہی گھوڑے رہ گئے۔ اِک ہر بچن سنگھ رندھاوے اور دوسرا راجندر سنگھ سندھو کا۔ اور فوجے نے پھر اُونچی آواز سے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

''لو، بھئی، اَب آخری تین میدان۔''

اور تین آخری میدان ہمیشہ ہی یہی دو بندے دوڑتے تھے۔ راجندر بھی سوہنی سانگ مارنے والا گبھرو تھا اور ہر بچن سنگھ کے بارے میں مشہور تھا کہ چاہے آنکھیں بند کر کے ہی سانگ مارے۔ کلہ ضرور اُڑا لے جاتا تھا۔ اور سچی بات تو یہی تھی ہر بچن سنگھ کی طرح سانگ مارنا کسی بندہ ذات کا کام نہیں تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے۔

''ہر بچن سنگھ کو ضرور کسی پیر فقیر کی دُعا ہے۔ نہیں تو آنکھوں پر پٹی باندھ کے کوئی بندہ ذات کلہ اُڑا سکتا ہے۔''

اور ہر بچن سنگھ سچی مچی آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایسی سانگ مارا کرتا تھا کہ یا تو کلہ پھاڑ کے پھینک جاتا اور یا سانگ میں پرو کے لے جایا کرتا تھا۔ سانگ مارنے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

پہلی دوڑ کا آغاز ہوا۔ ہر بچن پہلے دوڑا۔ پٹی پہ لے جا کر اُس نے گھوڑے کو للکارا اور یوں لگا جیسے گھوڑا ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ کلے کے سرے پر آ کے ہر بچن سنگھ نے گھوڑے کو پھر للکارا۔

''ہلا بھئی بگیا''

اور بگا زمین کے ساتھ لگ گیا۔ اُس نے داہنی رکاب پر اُلر کے کلہ سانگ پر یوں چڑھایا گویا ہاتھ سے اُکھاڑا ہو۔ اور وہ ''بلے بلے'' اور ''واہ وا'' کے شور میں شوں کر کے گزر گیا۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ ہر بچن کی اُستادی میں اُس کے گھوڑے کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ راجندر سنگھ دوڑا، اُس نے سانگ ماری اور کلہ وہ بھی پھاڑ کے پھینک گیا۔ دوسرے میدان میں ہر بچن کلہ پھر لے

گیا۔ اور راجندر کی سانگ تقدیراً ہی کلے سے ہاتھ بھر آگے پڑی۔ تیسرے میدان میں ہربچن پھر کلہ لے گیا۔ اور ساتھ ہی ہربچن سنگھ نے ہاتھ کھڑا کر کے راجندر کو للکارا۔

''راجندرا! یہ میدان اگر تو لے جائے تو، تو ہی جیتا'' اجاگر سنگھ رندھاوا اس بات سے تڑپ کر رہ گیا۔ اندر سنگھ ورک نے شمشیر سے کہا۔

''ہربچن نے بڑا مورکھ پن کیا ہے۔''

اور شمشیر سنگھ نے ایک موٹی سی گالی ہربچن کو نکال دی۔ ادھر سے کرتار سنگھ کے بیٹوں نے راجندر کو مل کر ہشکارا۔

''شاوا بھئی راجندر، تگڑا ہو کے۔''

ہربچن سنگھ للکارے سے کھار کھا گیا اور راجندر سنگھ نے گھوڑا پٹی پر ڈال کر ایڑ لگا دی۔ اور سانگ ماری۔ سانگ مارنا ہر بندے کے بس میں ہے لیکن کلہ اکھاڑ لے جانا نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ اور راجندر کلہ پھر نہ اُکھاڑ سکا۔ راجندر کے بھائی چیخ اُٹھے۔

''ایک میدان اور، ایک میدان اور''۔

اور شمشیر نے کرپان اُٹھا کر نعرہ لگایا۔

''ہربچن جیت چکا ہے۔''

اور خلقت نے بھی شور بپا کر دیا۔

''ہربچن جیت گیا ہے۔ ہربچن جیت گیا ہے۔''

اور ورکوں اور کھرلوں نے میدان میں جا کر ہربچن کو سر پر اُٹھالیا۔ اور شمشیر گھوڑی سے چھلانگ مار کے اُترا اور بھنگڑا ڈالنے لگا۔ اُس نے کان پر ہاتھ دھر کے ہانک لگائی۔

''اوئے جٹا دانا بادنوں چل۔''

اور پھر گبھرو اس کے اردگرد تھے۔ اور بھنگڑا پورے جوبن پر تھا۔ شمشیر سنگھ تو یوں لگتا تھا گویا پاگل ہو گیا ہو۔

اور کرتار سنگھ اپنے بیٹوں سے کہہ رہا تھا ''اوئے منڈیو! جھگڑے سے بچنا۔ انھوں نے بڑا اکٹھ کر رکھا ہے۔ یہ چالیس جوان جو بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔ تمھارے لہو کے پیاسے ہیں۔ اور اُجاگر سنگھ والے لوگ تو لڑائی کا بہانہ تلاش کر رہے ہیں۔''

اور کرتار سنگھ کے بڑے بیٹے نے جل بھن کر کہا، ''تو اب کیا گاؤں چھوڑ جائیں،

بھائیا''۔

''اوئے ماں کے خصمو! تمھیں غصہ کیوں چڑھتا ہے بھنگڑے سے! وہ جیتے ہوئے ہیں آخر
''

وہ تو فوجے نے کرتار سنگھ کو موڑا۔

''او، کرتار سیاں! جانے دے کیا سال کے اِس تہوار پر لڑکوں کو گالیاں دیے جا رہا ہے۔ ہار جیت ساتھ ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اگلی بار راجندر جیت جائے گا''۔

پر ابھی تو شام والی دوڑ باقی ہے۔ جا اوئے راجندرا۔ گھوڑے کو پھرا بیٹے۔ ہارتے بھی تو سورما ہیں آخر۔ کیا ہوا؟''

اُدھر بھنگڑا بڑے زور پر تھا۔ سخت سردیوں میں بھی گبھروؤں کے پسینے ایڑیوں تک چھوٹ گئے اور اندر سنگھ نے پہلی آواز لگانے کے لیے ہاتھ بُلند کیا۔ جوان ٹھہر گئے، پگڑیوں کے ڈھیلے بل کسنے اور چادریں دوبارہ دُرست کرنے لگے۔ شمشیر سنگھ کی پگڑی کھل کر اُس کے گلے میں پڑ چکی تھی۔ اُس نے ہر بچن کو کاندھوں پر یوں اُٹھا رکھا تھا، جیسے اُس نے کوئی بچہ اُٹھا رکھا ہو!

دین محمد ورک نے ڈھول والے مراثی کو آواز دی جو نوجوانوں کے ہاتھ میں ڈانگیں، برچھیاں اور نکوے دیکھ کے دُور سہا کھڑا تھا۔ دینے نے پھر آواز لگائی۔

''اوئے دادا۔ کھوتے کے کھرا۔ اندر آ، باہر کس لیے کھڑا ہے۔''

اور دادے نے میدان میں آ کے ڈھول پر ڈگا لگایا اور اندر سنگھ نے ہیک لگائی۔ ڈھول پر ڈگا پڑتے ہی رُکی ٹانگیں اور اُٹھے ہوئے بازو پھر (مِل جل) ایک ہو گئے۔ گبھرو پھر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ وہ سبھی پاگل سے دِکھائی پڑتے تھے۔ اور نیزہ بازی دیکھنے والا سارا ہجوم اَب بھنگڑے کا پڑ بن گیا ہوا تھا۔ اور خلقت بلے بلے اور شاوا شاوا کر رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ''بھئی ایسا باکمال اور سُتھرا بھنگڑا آج تک نہیں دیکھا ہے۔''

اور کچھ دور، پرے ہٹ کے سردار اُجاگر سنگھ، حاکو کھرل اور سات آٹھ اور بندے ایک ٹیلے پر کھڑے تھے۔ پاس ہی نِکا عیسائی گھوڑے کو پھیرنے میں لگا ہوا تھا۔ سردار اُجاگر سنگھ بڑا خوش تھا۔ بار بار اپنی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ دور سے جنڑاں والا لالہ گردھاری مل چلا آ رہا تھا، صاحب سلامت کر کے آہستہ سے کہنے لگا۔ ''سردارا! گھوڑے کے دام بتا۔''

اور سردار کا غصے سے منھ پھول گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اُس کی سفید

مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ سخت غصے میں بڑی مشکل سے بولا۔ ''لالہ چلا جا۔ چپ کر کے۔ نہیں تو ڈانگ مار کے سری توڑ دوں گا۔'' اور سردار اُجاگر سنگھ نے حاکو سے ڈانگ پکڑ لی۔ اور لالہ گردھاری مل کان لپیٹ کر چل پڑا۔ سردار اُجاگر سنگھ، ابھی تک بڑا بڑا رہا تھا۔

''ماں کا خصم! بڑا شاہوکار۔ آیا ہے گھوڑے کے دام لگانے۔''

اور شام ڈھلے جب سورج مغرب میں دھرتی سے ڈانگ بھر اُونچا تھا ڈھول پر چوٹ پڑی اور خلقت دوڑ دیکھنے کے لیے باغ کی دوسری جانب اکٹھی ہونے لگی۔ دو منصف گھوڑیوں پر بیٹھ چندوال پہنچ چکے تھے۔ چندوال، میدان سے پورے چھ کوس تھا اور گھوڑ سواروں نے چندوال کے منصفوں سے سفید دوپٹے لے کر آنے تھے اور پہلے پہنچنے والے نے جیت جانا تھا۔ دوڑ کے لیے پندرہ گھوڑے نکلے۔ ہربچن سنگھ نے گھوڑے کا تنگ کس کے شمشیر کو آواز دی اور کہنے لگا ''لے، آج تو دوڑ۔''

پیچھے سے سردار اُجاگر سنگھ بولا ''اوئے تو آپ دوڑ۔ اوئے ہر بچنیا! اسے کیا پتا ہے؟''

''نہیں چاچا، یہ کوئی بچہ ہے، مجھ سے اچھا سوار ہے۔'' اور پھر وہ شمشیر سے کہنے لگا ''ایڑی گھوڑے کے بدن سے نہ چھونے پائے اور باگیں ذرا کس کے رکھنا اور لے چڑھ اب رب سچے کو یاد کر۔''

اور اُس نے شمشیر کو گھوڑا پکڑا دیا۔ شمشیر نے گھوڑے پر بیٹھ کے پگڑی کے اُوپر رومال باندھ لیا۔ اور چادر درست کی۔ فوجا سنگھ نے لکیر کھینچ دی اور گھوڑے لکیر پر آ گئے۔ فوجا سنگھ، نے ہاتھ کھڑا کر لیا۔

''ایک''

''دو''

ہربچن سنگھ نے شمشیر کو آواز دی ''پہلی چھلانگ پر گھوڑے کو ڈھیل دینا۔''

''تین''

اور گھوڑے یوں اُٹھے جیسے کمانوں میں سے تیر نکلتے ہیں۔ شمشیر سنگھ کے گھوڑے نے پہلی چھلانگ لگائی تو دوسرے گھوڑوں سے آگے نکل گیا۔ اُوپر سے شمشیر نے ہربچن کی طرح گھوڑے کو للکار ''شاوا بھئی بگیا۔''

اور اتنی دیر میں گھوڑے دور چلے گئے تھے اور گرد کے بادل راستے میں دیوار بن کے دیکھنے والوں کے سامنے آن کھڑے تھے۔

حاکو کھرل کہنے لگا ''بھئی بڑی اُٹھان ہے گھوڑے کی۔''

اندر سنگھ کہنے لگا ''اوئے چاچا! جو گھوڑا اُٹھتے ہی اٹھارہ ہاتھ چھلانگ لگا کے نکل جائے پھر وہ کسی اور گھوڑے کو کہاں ساتھ ملنے دیتا ہے۔''

اور سردار اُجاگر سنگھ غصّے میں ہربچن سنگھ کو گالیاں دیے جا رہا تھا کہ اُس نا تجربہ کار سے لڑکے کو کیوں گھوڑے پر بٹھا دیا۔

ساری خلقت کی نظریں مغرب کی سمت لگی ہوئی تھیں، دور دراز سے گرد کا بادل اُڑتا چلا آ رہا تھا۔

''آ گئے، آ گئے''۔

لوگ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے کہنے لگے تھے۔ گرد کا بادل چھٹا تو اندر سے ایک گھوڑا نظر آیا۔ وہ بگا تھا۔ خلقت نے بلے بلے کا شور مچا دیا۔ حاکو کھرل ہربچن کے کندھے پر تھپکی دے کر کہنے لگا ''لے بھئی پتر، مبارکیں۔ تیرا گھوڑا جیت گیا ہے۔''

''رب سچا عزتیں رکھنے والا ہے چاچا، مجھے اپنے گھوڑے پر مان بھی بڑا تھا، چاچا۔''

دو، پیلیوں کے فاصلے پر آ کر شمشیر سنگھ گھوڑے سے اُتر گیا۔ وہ اور اُس کا گھوڑا دونوں ہی پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ ہربچن سنگھ نے آگے بڑھ کے پہلے شمشیر کو تھپکی دی پھر گھوڑے کو۔ اور گھوڑا اُس سے لے لیا۔ شمشیر سنگھ نے کمر کے گرد بندھا دوپٹہ کھولا اور بازو کھڑا کر کے کہنے لگا ''بھئی یہ ہے بھائیو مالی کا دوپٹہ۔''

اور خلقت کو دکھا کے اُس نے دوپٹہ پگڑی کے گرد لپیٹ لیا۔ خلقت گھوڑے اور شمشیر

کے اردگرد اکٹھی ہوگئی اور ہر بچن نے نکے کو آواز دی ''لے بھئی نکیا، گھوڑے کو پھیر۔ اسے ٹھہرنے نہ دینا''۔ شمشیر سنگھ خوشی سے چوڑا ہوا کھڑا تھا، کہنے لگا ''اوئے بھاؤ! گھوڑا کیا ہے، بلا ہے بلا۔ بھئی میری تو آنکھیں ہی نہیں کھلنے دی ہیں گھوڑے نے۔ اور باگیں کھینچ کھینچ کر میری تو باہیں ہی ڈھیلی پڑگئی ہیں۔''

اور سردار اجاگر سنگھ کا خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہا تھا۔ حاکو کھرل، پھر ڈھول والے کو پکڑ لایا اور گبھرو پھر لنگوٹے کس کر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ سردار اُجاگر سنگھ نے جوانوں کو آواز دی۔

''اوئے لڑکو۔ اب جانے دو۔ شام پڑنے لگی ہے اور سردی اُترنے لگی ہے۔ اب گاؤں کو چلو۔''

دینے وِرک نے آگے سے جواب دیا ''او، چاچا، ہمیں ذرا موج میلہ تو کر لینے دے۔ اور گاؤں آج بھنگڑا ہی جائے گا۔''

''اوئے چھوڑو جوانو۔ پہلے ہی دوپہر کے تھکے ہو۔ گاؤں جا کے کوئی گانے والا بلا لینا''۔

''وہ بھی ہوگا چاچا۔''

اور بھنگڑا گاؤں کو چلا۔ شمشیر سنگھ نے اندر سنگھ کو آنکھ ماری اور اندر سنگھ خاموشی سے بنا کسی کو احساس دلائے بھنگڑے میں سے نکل گیا۔ بعد میں شمشیر بھی اُس سے آن ملا۔

''گھوڑیاں؟'' اُس نے پوچھا۔

''کرتاری کے پاس ہیں۔ میں لے آتا ہوں۔''

''اور میری کرپان؟''

وہ بھی وہیں پر ہیں۔ میرا کھونڈ بھی وہیں پر ہے۔ تو یہیں ٹھہر۔ میں لے کر آتا ہوں۔'' اندر سنگھ اس سے کہہ کر چل پڑا۔

اور کچھ دیر بعد وہ دنوں گھوڑیاں اور ڈانگیں لے آیا۔ ''کسی نے میرا پوچھا تو نہیں؟''

''پوچھا تھا۔ چاچے نے اور میں اُس سے کہہ آیا ہوں۔ بھئی ہم دربار صاحب ماتھا ٹیکنے چلے ہیں۔''

''اور کیا کہتا تھا بھائیا۔'' شمشیر نے اس سے پوچھا۔

''اور کیا کہتا تھا۔ یہی کہ جلدی لوٹ آنا اور کہیں جھگڑا نہ کر لینا۔''

''بھائیے کو جھگڑے کا بڑا خیال رہتا ہے اندرا۔'' شمشیر نے کہا۔

''اوئے باپ جو ہوا خیال نہ کرے۔'' اندر سنگھ نے کہا اور وہ گھوڑیوں پر چڑھ گئے۔

''ذرا جلدی چلیں، کہیں چلے ہی نہ گئے ہوں۔'' شمشیر اندر سے کہنے لگا۔

''چل بھائی۔''

اور، انھوں نے گھوڑیوں کو ایڑ لگا دی۔ میلے سے لے کر دربار صاحب والے گُردوارے تک خلقت ہی خلقت تھی۔ یوں لگتا تھا کیڑوں کی قطار میلے سے دربار صاحب کو چلی جا رہی ہو۔ شمشیر سنگھ اور اندر سنگھ راستے کے ساتھ ساتھ گھوڑیوں کو خراماں خراماں لیے جا رہے تھے۔ شمشیر جانے والوں کو بڑے دھیان سے دیکھتا جاتا تھا۔ دربار صاحب گُردوارے کے آگے جا کے انھوں نے گھوڑیاں روک لیں۔ دِن ڈُوب چلا تھا، سردی اور ٹھنڈک، نمی نمی پھوہار کی مانند پڑ رہی تھی۔ انھوں نے کندھوں سے چادریں اُتار کے بکلیں مار لی تھیں۔

''اب۔'' اندر سنگھ نے شمشیر سے کہا۔

''تو، یہیں ٹھہر اور میں ذرا اندر جھانک لوں۔ ساتھ ہی ماتھا ٹیک آؤں۔''

''اچھا۔''

اور شمشیر سنگھ اُسے گھوڑی اور کرپان پکڑا کر گُردوارے کے اندر چلا گیا۔ گردوارے کے صحن کے سفید اور سیاہ مَرمَر کے فرش پر وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دھیان دوڑایا تو بھیڑ بہت تھی۔ اور اس قدر بھیڑ میں سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ اُس نے اندر جا کے ماتھا ٹیکا، وہ صحن میں آنے کے لیے دیوار سے لگا کھڑا تھا کہ کہیں پاس ہی سے ایک ہلکی سی، اُداس سی اور سوہنی، شیریں آواز اُبھری۔ شمشیر کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آواز یقیناً روپو کی تھی۔ شمشیر کو یقین تھا۔ روپو کی آواز اور اُس کا دیکھنا دونوں چیزیں ہی ایسی تھیں جو شمشیر نے کسی اور مُٹیار میں نہ دیکھی تھیں۔ اُس کی آواز ایسی تھی جو سُننے والے سے تقاضا کرتی ''پہلے مجھے سن۔'' اور وہ آواز بندے کے بدن کو چیرتی ہوئی دِل میں جا کھبتی تھی۔ اور شمشیر تو جب یہ آواز سنتا اس کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ اس آواز کی کوئی مثال نہ تھی۔

اور وہ روپو تھی دوسری دیوار سے لگ کر کھڑی ہوئی۔ شمشیر نے ادھر دیکھا تو روپو نے دوپٹہ درست کرنے کے بہانے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر بڑے ناز وادا کے ساتھ اُسے سلام کیا۔ شمشیر نے بھی آنکھوں آنکھوں میں اُس کے سلام کا جواب دیا۔ اور اُسے باہر صحن میں آنے کا

اشارہ کر کے آپ بھیڑ کو چیرتا ہوا صحن میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد روپو نکلی اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ داہنی دیوار سے شمشیر لگا کھڑا تھا۔ وہ ادھر مڑی۔ شمشیر کے پاس جا کے ٹھہر کے وہ پھر صحن کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے کسی کو ڈھونڈتی ہو۔ شمشیر نے آہستہ سے اُسے آواز دی۔

اور روپو نے ایک بار مڑ کے دیکھا اور پھر منہ پھیرلیا۔

''مڑھیاں والے کھوہ پر علی الصبح'' اور شمشیر کہہ کر صحن میں سے باہر کے دروازے کی سمت چل پڑا۔ دروازے والی سیڑھیوں پہ ٹھہر کر اُس نے پیچھے مڑ کر ایک پل دیکھا۔ روپو وہیں پر کھڑی تھی۔ اُس کا کیسری دوپٹہ سر سے سرک کر گلے میں آ چکا تھا۔ اور وہ دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اور اُس کی نظریں شمشیر سے کہہ رہی تھیں۔ ''چل پرے! بڑا آیا رعب ڈالنے والا''۔ اور شمشیر باہر نکل آیا۔ اندر سنگھ نے اُسے آواز دی۔

''او، شمشیر سیاں۔''

''اُداس ہو گیا ہے اِندرا!'' شمشیر نے قریب جا کے اِندر سے کہا اور پھر وہ دونوں ہنس پڑے۔

''بہت خوش ہے۔'' اِندر سنگھ نے لہک کے کہا۔

''ہاں۔''

''دیوی کے درشن ہو گئے ہیں۔''

''ہاں۔''

''اوئے، پر تو، تو مجھے بھابی دِکھانے لایا تھا۔''

''دِکھاتا ہوں بیٹا۔ سانس لے۔'' شمشیر نے اندر سے لاڈ بھری محبت سے کہا، اور وہ چھلانگ مار کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

دوسری جانب سے سوداگر سنگھ اپنے پانچ چھ یاروں کے سنگ چلا آ رہا تھا۔ سوداگر سنگھ کرتار پور کا بدمعاش تھا۔ ڈاکے چوریوں میں بھی اُس کا نام تھا اور دس نمبریا ہونے کی وجہ سے لوگ اُس سے ڈرتے بھی تھے۔ شروع شروع میں ایک دو بار وہ شمشیر سنگھ سے مار کھا بیٹھا تھا اور اس لیے اب وہ بڑا سیدھا پدھرا ہو چکا تھا۔ دور ہی سے سلام کرتا تھا۔ اُس دِن سوداگر شراب پی کر نشے میں اندھا ہو چکا تھا، اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک بازو سے اُس کے ایک یار نے تھام رکھا تھا، اُس کا ایک پاؤں یہاں پڑتا تھا تو دُوسرا کہیں اور۔ وہ ماہیا گا رہا تھا۔

گردوارے کے باہر دروازے کے سامنے والے تالاب کے پاس آ کے وہ ٹھہر گیا۔ عورتیں، مرد گردوارے کے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ روپو کی ماں نکلی تو شمشیر نے آہستہ سے اندر سے کہا۔ ''لے بھئی اب ذرا دھیان سے دیکھتے جانا۔''

''کون سی ہے؟'' اندر سنگھ، اندر سے نکلنے والی عورتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''دیکھتا جا اور خود ہی پہچان لے۔''

''اچھی بات ہے۔ بھئی مجھے کیا معلوم وہ کون سی ہے۔''

''دیکھتے جاؤ پہلے، پھر میں تمھیں بتاتا ہوں۔''

اور سوداگر سنگھ ابھی تک گائے جا رہا تھا۔

''بگّا ککڑ بنیرے تے، کاسنی دوپٹے والیے مُنڈا عاشق تیرے تے۔'' (سفید مرغا بنیرے پر، کاسنی دوپٹے والی، لڑکا عاشق ہے، تجھ پر) اور روپو کو نکلتے دیکھ کر یوں لگا جیسے سوداگر سنگھ اپنے ہوش حواس گنوا بیٹھا ہے۔

''اوئے صدقے جاواں کیسری دوپٹے والیے۔'' (تجھ پر قربان جاؤں او کاسنی دوپٹے والی)

اور کسی نے قریب سے کہا ''سوداگر سنگھا! یہ گردوارہ ہے۔ اور پھر کسی کی بہن، بیٹی کو اس طرح کا مذاق نہیں کیا جاتا۔''

اور سوداگر سنگھ، ہوا کے گھوڑے پر چڑھ گیا۔ ''یہ میرا گاؤں ہے۔ میں یہاں کا شہنشاہ ہوں۔ اور یہ روپو تو ہماری جان ہے۔ ہائے او میں صدقے۔'' وہ چھاتی پر ہاتھ مار کے کہنے لگا۔

روپو کی ماں سوداگر سنگھ کو گالیاں دینے لگ گئی تھی اور اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ روپو نے پرے کھڑے شمشیر کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''شمشیر یا! بڑا سورما بنا پھرتا ہے۔ اب چپ رہ کر میری بے عزتی ہی دیکھتا رہے گا۔'' اور شمشیر سنگھ نے اندر سنگھ کو اپنی کرپان دے کر اُس کا کھونڈا پکڑ لیا۔ اور گھوڑی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

''اوئے شمشیر سنگھ، چھوڑ ہمیں کیا۔؟''

''اوئے بہنیں، بیٹیاں سارے گاؤں کی سانجھی ہوتی ہیں۔''

اور وہ لوگوں کو دھکے مارتا ہوا بھیڑ میں داخل ہوگیا۔

''سوداگر سنگھا! ہوش کر۔ کہاں کھڑا ہوکر تو یہ باتیں کر رہا ہے۔ بہنوں، بیٹیوں کی شرم بھی نہیں تجھے؟''

شمشیر سنگھ اُسے پیار سے سمجھانے لگا۔

''اوئے یہ تیری بہن ہے۔ کون ہے تو، بڑا بہن والا۔ ماں کا خصم!'' سوداگر سنگھ نے اپنی آنکھوں پر گری پگڑی کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

شمشیر کو اس سے بڑی گالی آج تک کسی نے نہیں دی تھی۔ اُس نے کھونڈ سر سے اوپر نکال لیا اور خلقت کو للکارا۔ ''اگر جان کی امان چاہتے ہو، تو پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اور پھر کھونڈ اوپر اُٹھتے ہوئے نظر آتا تھا یا پھر سوداگر سنگھ کی چیخ پُکار سنائی دیتی تھی۔ دوسری طرف سے کرتار پور کے پانچ سات ڈانگوں والے بھاگے چلے آتے تھے۔ میدان میں آنے لگے تو پیچھے سے اندر سنگھ نے للکارا۔ ''تگڑا ہوجا شمشیر سنگھا! میں بھی آ رہا ہوں۔''

اور ڈانگوں والے سہم کر وہیں کھڑے ہوگئے جہاں تھے۔ بھلا وہاں پر شمشیر سنگھ اور اندر سنگھ کو بُھولا کون تھا۔ اکیلا شمشیر ہی پورے گاؤں کا سورما تھا اور پھر اندر سنگھ۔ اور یہ دونوں تو پورے میلے کو آگے لگا لیتے تھے۔ خلقت میں سے تو کسی کو بھی حوصلہ نہ تھا پڑتا کہ شمشیر کو موڑ ہی دے۔ وہ تو خدا بھلا کرے گرنتھی کا۔ اُس نے اور اندر نے آ کے ہاتھوں سے کھونڈا چھینا۔ نہیں تو شمشیر غصّے میں سور کی مانند ہو رہا تھا۔

شمشیر نے کرتار پور کے ڈانگوں والے لڑکوں کو للکارا ''لے جاؤ اب علاقے کے اس شہنشاہ کو چارپائی پہ ڈال کے اور اس سے سویرے پوچھنا بہنوں، بیٹیوں کی عزّت کا مول کیا ہوتا ہے''۔

شمشیر سنگھ، اپنی پگڑی دُرست کر کے خلقت میں سے نکلا اور گھوڑیوں کے پاس جا کر اُس نے اندر سنگھ کو اشارہ کیا اور وہ چھلانگیں لگا کے گھوڑیوں پر چڑھ گئے اور قدم قدم گھوڑیوں کو چلاتے ہوئے گردوارے کے سامنے سے گزر کر گاؤں والے راستے کی جانب چل پڑے۔

''یوں ہی غریب کے بیٹے کی ٹھکائی کر دی تو نے شمشیر سنگھا۔''

''اُس کا علاج ہی یہی تھا۔''

''وہ تو خدا کا شکر ہے جو اُسے کہیں ایسی جگہ نہیں پڑ گئی۔ تو، تو لڑائی میں بالکل ہی سور ہو جاتا ہے۔'' اندر سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔

''اوئے اندرا! یہ میلہ تو یوں ہی بے مزا گزر چلا تھا'' شمشیر گھوڑی کو تھپکی دے کر کہنے لگا۔

'' چل شکر کر میلہ مزے دار تو ہوگیا ہے۔ اوئے پر، بھابی کو دیکھنا تو پھر بیچ ہی میں رہ گیا۔'' اندر کہنے لگا۔

''دیکھ تو چکا ہے۔ اور کیا کہتا ہے۔''

''کون تھی وہ اوئے شمشیریا۔ کیا بجھارتیں ڈال رہا ہے۔'' اندر سنگھ حیرت زدہ ہوکر کہنے لگا۔

''روپو۔''

اور اندر سنگھ گھوڑی پر بیٹھا بیٹھا یوں اُچھل پڑا جیسے اُسے کاٹھی سے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ اور اُس کی طرف دیکھ کے کہنے لگا ''اوئے، عقل کی بات کر اوئے شمشیر سنگھا۔ یہ کیا جھوٹ بک رہا ہے۔''

''جھوٹ نہیں۔ سچ ہے۔ اندر سنگھا! قسم واہگورو کی۔''

اور اندر سنگھ نے تسلیم کرلیا۔ اُسے پتا تھا کہ شمشیر اُس سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

''پر شمشیر شاید، یہ بات نہیں اچھی۔''

''کیوں؟ تجھے روپو پسند نہیں؟''

''اوئے روپو کو پسند کون نہیں کرتا۔ روپو تو تمھارے گاؤں کا دیا ہے دیا۔ پر تیرا باپ۔ تیرا بھائی۔ روپو کے گھر والے اور دُنیا۔ شمشیر سنگھا! یہ کام سرے نہیں چڑھے گا''۔ اندر سنگھ کہنے لگا۔

''اوئے پر تو کہاں تک پہنچا ہے؟''

''ابھی تو ابتدا ہے برادر۔''

''اوئے پھر، وقت ہے شمشیر سنگھا لوٹ جا۔ دونوں گھر اُجڑ جائیں گے۔ ایک اِس بات سے۔''

''رب سے سکھ مانگ۔ یہ بات ہوجائے تو رندھاوے اور سندھو بھم ہوجائیں ایک بار پھر۔''

''اوئے نہیں شمشیر سنگھا، یہ تمھاری بھول ہے۔ تو دونوں گھروں کی بات کرتا ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں اگر تیرا باپو ہی اِس بات پر راضی ہوجائے تو میں جھوٹا۔''

''باپو کو میں آہستہ آہستہ راستے پر لے آؤں گا اندرا۔ وہ یقیناً مان جائے گا۔''

''اوئے مورکھا! کبھی دریا کو بھی بند باندھا جا سکا ہے، تجھے پھر اپنے باپ کے بارے میں پتا ہی نہیں، تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ تو سندھوؤں کا نام سننے کا بھی روادار نہیں اور تو یہ اتنی بڑی بات کہہ رہا ہے۔''

''تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟'' شمشیر سنگھ بے بس سا ہو کر کہنے لگا۔

''اس کا کوئی علاج نہیں شمشیر سنگھا۔''

''پھر بھی؟''

''میری دانست میں تو اِس کا علاج فقط یہی ہے کہ اس بات کا بھید کسی دُوسرے پر نہ کھلے۔ پھر آگے جا کر دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔''

''بس۔''

''ہاں۔ تو پھر بات سن شمشیر سنگھا۔ اس بات کو خوب اچھی طرح سے سوچ لے۔ اوئے یہ عورتیں بڑی گہری ہوتی ہیں کوئی نیا چاند نہ چڑھا لینا۔''

''اوئے نہیں، روپو، ایسی نہیں اندرا۔''

''یہ بات وثوق سے کون کہہ سکتا ہے۔ عورت کا بھید تو بڑے بڑے نہیں پا سکے۔ اوئے یہ بڑی گنجھل دار ہوتی ہیں۔ بندہ رب میں تو جھانک سکتا ہے، لیکن عورت میں نہیں۔''

اِندر! ایسا نہیں ہے! روپو تو بڑی سیدھی سادی معصوم سی لڑکی ہے۔ اُس میں گنجھل نہیں۔''

واہگورو کرے اِس میں نہ ہوں۔ پر شمشیر سنگھا! ایسی ہی سیدھی اور معصوم سی لڑکیوں نے بڑے بڑے سورماؤں اور جوانوں کو چت کر دیا ہے۔ میں تو تجھے یہی نصیحت کروں گا شمشیر سنگھا! کہیں فریب میں نہ آ جانا روپو کے۔ اور تو جانتا ہے کہ اگر کرتار سنگھ کے بیٹوں کا بس چلے تو، تم دونوں بھائیوں کا خون پی جائیں۔ تجھے میں بار بار یہی کہتا ہوں کہ کہیں فریب نہ کھا جانا۔''

''اوئے اچھا بڑے حکیم افلاطون جی''۔ شمشیر سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔ وہ گاؤں میں داخل ہو گئے۔ حویلی کے پاس آ کر اندر سنگھ کہنے لگا۔

''حویلی میں بڑی رونق ہے شمشیر سنگھا۔''

''اوئے رندھاووں نے میلہ جیتا ہوا ہے کوئی مذاق ہے۔'' شمشیر سنگھ اکڑ کر کہنے لگا۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے۔ حویلی میں چارپائیاں ہی چارپائیاں پڑی تھیں۔ آدھا گاؤں

---

[۱] برآمدہ نما، جہاں جانور بھی باندھے جا سکتے ہیں۔

وہاں جمع ہو چکا تھا۔ کچھ باہر کے مہمان بھی تھے۔

وہ گھوڑیوں سے اُترے۔ نِکے عیسائی نے گھوڑیاں پکڑ لیں۔

سردار اُجاگر سنگھ رندھاوا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ لڑکوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ''اوئے لڑکو! بہت دیر کر دی ہے تم نے۔ اوئے شمشیریا! گھر جا۔ اپنے بھائی کے ساتھ مہمانوں کے لیے کھانا لے آ۔ اور چار راگی بھی ہیں۔ انھیں بھی کھانا کھلاؤ تا کہ یہ اپنے کام میں لگیں۔''

''اچھا بھائیا۔'' اور شمشیر گھر کو چل پڑا۔

سردار اُجاگر سنگھ کی حویلی کے ساتھ ڈھارا[1] تھا اور راگی وہیں میدان جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ بوتلوں پر چڑھے ہوئے جوار کے تکلوں کے ڈھکن کھولے جا رہے تھے۔ اور سرداروں کی مونچھیں اور داڑھیاں شراب میں بھیگ رہی تھیں۔ باہر، چمٹا، ڈھولکی، سارنگی اور جوڑی، سب ساز، سردیوں کی چپ چپیتی رات کا سینہ چیر رہے تھے۔ راگی نے راگ چھیڑا۔

''اوّل حمد خدا دی کہیے۔''

اور سردار اُجاگر سنگھ رندھاوا اُٹھ بیٹھا۔ ''چلیے''۔ حاکو کھرل نے شراب سے بھیگی مُونچھیں پونچھ کر کہا ''ذرا ٹھہر جا۔ مہمان تسلی سے کھانا کھالیں۔ اور پھر وہ مہمانوں سے مُخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''بھائیو۔ جل بھوجن اور۔ ابھی پانچ سات بوتلیں ہیں۔''

''بس۔ بس سردار جی۔ سیر ہو گئے ہیں۔''

اور شمشیر سنگھ بوتل میں بچی ہوئی شراب لوہے کے گلاس میں ڈال کے ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''اور نہ پینا اب'' اندر سنگھ نے کہا۔

''اوئے پینے دے جوان کو'' دینے وِرک نے پرے کھرلی میں پڑی ایک اور بوتل پکڑ کر اُٹھائی۔

شمشیر سنگھ نے اندر سنگھ کے کان کے قریب ہو کے کہا۔ اُس کی آواز اُکھڑی ہوئی تھی۔

''اندرا! میری نگاہوں کے آگے رو پوقص کرتی نظر آ رہی ہے۔''

اور اندر سنگھ نے اُس کا کندھا دبا کے اُسے خاموش کرا دیا۔ ''چلو باہر گانا شروع ہو چکا ہے اور سبھی لوگ سننے جا چکے ہیں۔'' اندر سنگھ نے کہا اور وہ اُٹھ کے باہر آ گئے۔

ڈھارے کے ساتھ لگے برگد کے درخت کی شاخوں سے ٹنگی ہوئی لالٹینوں کی روشنی میں

بیٹھے لوگ یوں دِکھائی دے رہے تھے جیسے دریا کنارے گھاس کے بوٹے اور میدان میں پھرتے راگی یوں جیسے مڑھیوں میں پھرتے بھوتنے۔ کہیں کہیں کوئی سردار اپنی ہی مستی میں بڑھک پڑتا یا ''واہ وا'' کا نعرہ مار دیتا تھا۔ گائیک کو تو انھوں نے گانے ہی نہیں دیا۔ ویل پر ویل۔ ویل پر ویل۔ چمٹے والے راگی نے بُکل اتار کے کھیس زمین پر پھینک دیا اور زیادہ جوش اور گرمی سے گانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ جٹ اندھے ہو کر پیسے دینے میں لگے ہوئے ہیں اور پیسے لینے کا اس سے اچھا موقع شاید ہی دوبارہ ہاتھ آئے۔ اور حقیقتاً رندھاوے، وِرک اور کھرل بچی مچی آنکھیں بند کر کے پیسے دے رہے تھے۔ سردار اُجاگر سنگھ اور حاکو کھرل آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہوئے تھے اور رانوں کے نیچے زمین پر انھوں نے پیسے رکھے ہوئے تھے۔ ہاتھ اُٹھتے تھے اور پھر رانوں کے نیچے جاتے تھے اور پھر اُٹھتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ناموں کی ویلیں دے رہے تھے۔ اور اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ گانے والے جس میدان میں بیٹھے ہوتے تھے، لوگ تین چار دِن گزرنے کے بعد بھی وہاں مٹی سے نوٹ تلاش کر لاتے تھے۔

اور اس سلسلے میں شمشیر سنگھ اپنے بھائیے سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اور وہ اپنے یاروں کے ساتھ میدان کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے آگے ہر بچن کمبل کی بکل مارے بیٹھا تھا اُس کے اردگرد اُس کے یار بجن موجود تھے۔ سبھی خاموش تھے۔ اور آگے بزرگ جو آج مُنڈے بنے ہوئے تھے۔ راگی نے ''دُلّے بھٹی'' کی وار شروع کی اور محفل لوٹ لی۔ شمشیر سنگھ دونوں ہاتھوں سے ویلیں دے رہا تھا۔ راگی نے غرور میں آئے جاٹوں کی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور اب اُنھوں نے ''ویر جودھ'' کی واریں گانا شروع کر دیں۔

مُرغ نے پہلی اذان دی اور گھروں میں عورتوں نے چاٹیوں میں مدھانیاں ڈالنی شروع کر دیں۔ شمشیر سنگھ ہڑ بڑا کے اُٹھا۔

''کدھر؟'' اندر سنگھ نے اس کا بازو تھام کر کہا۔

''ذرا گھر چلا ہوں۔''

''پیسے ختم ہو چکے ہیں تو مجھ سے لے لو۔'' اندر کہنے لگا۔

''نہیں ایک کام یاد آ گیا ہے۔ میں ابھی لوٹتا ہوں۔'' شمشیر نے اپنی بُکل درست کی اور خاموشی سے رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ حویلی جا کر اُس نے کھرلی میں سے اپنی کرپان لی اور مڑھیوں کی جانب چل پڑا۔

مڑھیاں گاؤں کی دوسری جانب تھیں۔ گاؤں کی اُسی طرف سردار کرتار سنگھ سندھو کا گھر اور حویلی ساتھ ساتھ ہی تھے اور مڑھیاں اُس کے گھر سے سات آٹھ ایکڑ کے فاصلے پر تھیں۔ اور مڑھیوں کے ساتھ ہی پرے دو ایکڑ کے فاصلے پر بستر۔ جو غریب ساہوکار کی مانند سال میں سے آٹھ نو مہینے سوکھا رہتا اور ساون بھادوں میں سیلاب سے بھرا رہتا۔ اور گاؤں سے لے کر بستر تک مڑھیاں۔ بیچ میں اُجڑا ہوا باغ۔ ویران کنواں۔ بہت خوفزدہ کر دینے والی جگہ تھی یہ۔ اکیلا انسان حتیٰ کہ دو فرد بھی تو دوپہر کے وقت مڑھیوں میں سے نہیں گزرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ اور پھر یہاں رات سمے آنا بڑے دِل گُردے کا کام تھا، پھر سردیوں کی تاریک ترین رات میں۔ بڑے بزرگ کہا کرتے تھے وہ ''پکی[1]'' جگہ ہے۔ اور وہ جگہ حقیقتاً ''پکی'' تھی۔ کئی ایک لوگوں نے تو یہاں پر رات سمے رنگ دار رُوشنیاں پھوٹتی دیکھی تھیں۔ اور گانے کی آواز بھی سنی تھی۔ اور سخر دوپہر یہاں سے گزرنے والے کئی مردوں اور عورتوں کو پتھر پڑے تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کے شمشیر سنگھ کے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ معلوم نہیں یہ سردی کے کارن تھا یا پھر پکی جگہ کی خوف زدہ فضا سے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ رات کو پی ہوئی شراب کا تھوڑا تھوڑا خمار ہنوز اُس پر تھا۔ اور اُس کا دِل کہہ رہا تھا۔

''روپو نہیں آئے گی، روپو نہیں آئے گی۔''

اور وہ چلتا گیا۔ مڑھیوں میں پہنچ کے اُس نے کھیس کی بکل اور زیادہ کس لی اور وہ کنویں کی جانب چل پڑا۔ کنوئیں کے کنارے پر ایک سایہ سا نظر آیا۔ اب اُس کے بدن سے سردی کی شدید ترین لہر گزر گئی۔

''بہت سردی ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور اُس نے بُکل اور کس کے مار لی۔ تاروں کی روشنی میں اُس نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ وہ سایہ سا ٹھہر گیا۔

''کون ہے؟'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

سایہ کچھ نہ بولا، اُس نے کرپان کو اور زیادہ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑا اور پھر بولا، ''کون ہے، بولتا نہیں۔''

اور روپو کھلکھلا کر ہنس پڑی ''وے، ڈر گیا تھا ناں۔''

''لیجیے ڈر گیا تھا۔ پر تو کب کی آئی ہوئی ہے روپو!'' اُس نے بہانے سے بات بدلی۔ وہ

---

[1] آسیب زدہ

سوچنے لگا تھا بھئی یہ روپو بڑی دلیر اور دل گردے والی عورت ہے۔
''بہت دیر ہوگئی مجھے یہاں انتظار کرتے۔ اور کچھ دیر اگر تو نہ آتا تو میں نے چلے جانا تھا۔'' اور پھر وہ شمشیر کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔'' بیٹھ تو جا کہ تو کھڑے گاؤں سے آیا ہے۔''
اور شمشیر اس کے قریب ہی کنارے ہی بیٹھ گیا۔ اور روپو نے اپنی چادر کی بُکل درست کی اور پھر گفتگو چھیڑی۔''میں نے آنا تو نہیں تھا، لیکن پھر میں نے کہا کہ بے چارہ سردی میں انتظار کرتے کرتے مرجائے گا اور یوں میں چلی ہی آئی۔ لیکن وے شمشیریا! تو نے مجھے بلایا کس لیے تھا؟''
''دیکھنے کو۔''
''بس؟''
''ہاں''
''اور تو نے مجھے گردوارے میں نہیں تھا دیکھا۔'' روپو نے بڑی معصومیت سے کہا۔
''میرا تو جی چاہتا ہے کہ تجھے صبح شام دیکھتا ہی رہوں روپو۔''
''پر ایسی تاریکی میں تجھے میرا چہرہ نظر آتا ہے؟''
اور شمشیر ہنس پڑا۔
''رب کی قسم! تیرا چہرہ تو چاند ہے، چاند جو تاریکی میں زیادہ لشکتا ہے، جھلیے۔''
''بات سن وے، مجھے جھلّی نہ کہنا، تو ہوگا جھلا۔ آیا ہے بڑا نام دھرنے والا۔'' روپو کی آواز میں تھوڑا تھوڑا غصہ تھا۔
اور شمشیر پھر ہنس پڑا۔ نزدیک کی کسی جھاڑی میں سے گیڈر نکل کے بھاگا۔ اور دور جا کے ہونکنے لگا اور پھر اور زیادہ گیڈر! دوسرے گیڈر بھی ہونکنے لگے۔ شمشیر سنگھ، چوکنا ہوکر اِدھر اُدھر تاریکی میں دیکھنے لگا۔
''کیا دیکھ رہا ہے۔'' روپو کہنے لگی۔
''کچھ نہیں۔''
''نہیں کچھ تو ہے۔''
''میں دیکھ رہا تھا کہ کہیں تیرے بھائی تو نہیں چھپے ہوئے۔''
شمشیر نے ہنس کے بات کہہ دی۔

''وے میرے بھائی کوئی عورتیں نہیں ہیں کہ چھپے ہوں۔ وہ تو سورے ہیں، سورے۔ اور چھپنا سورماؤں کا کام نہیں ہوتا۔''

''بس چڑ گئی ہو بھائیوں کے نام سے؟''

''تو، باتیں ہی ایسی کرتا ہے۔ اور میں تیرا بہت لحاظ کرتی ہوں نہیں تو میں نے تو کبھی اپنے باپ کی بھی نہیں سُنی اور تو بے چارہ کہاں کا ہے؟'' روپو غصّے میں تھی۔

''بس بس بھئی تو، تو لڑنے لگ پڑی ہے۔ پر ہم نے کون سا تیرے آگے سر اُٹھانا ہے جو مرضی ہے کہتی جا۔''

اور روپو خوش ہوگئی اور چہک کر کہنے لگی ''وے سچّی مچّی۔''

''ہاں۔''

''قسم اٹھا۔''

''دھرم سے۔''

''بڑی قسم کھا۔'' روپو نے شمشیر کو تنگ کرنا شروع کیا۔

''قسم گورو کی۔''

''اور بڑی۔''

''تیری قسم۔''

''اور بڑی، یہ قسم میں نہیں مانتی۔''

''اس سے بڑھ کر اور کوئی قسم ہی نہیں۔''

اور روپو کا دِل کھل اُٹھا۔ خوشی سے نہال ہوکر کہنے لگی ''وے بس میں نے مان لیا!۔''

''قسم کھا۔'' شمشیر نے اُسے چھیڑا۔

''ارے اندھے! تو نے ضرور اپنا بدلہ لینا ہے۔'' ''پر۔'' وہ کچھ سوچنے لگی۔

''پر کیا؟'' شمشیر کہنے لگا۔

''پر اِن لڑائی جھگڑوں میں کیا رکھا ہے؟''

''اپنے بھائیوں سے پوچھ لینا''

''ہاں۔ تم لوگ تو بڑے بے چارے ہو۔ جو پیسہ پھینک کے لڑائی لیتے ہو۔ وے سچی مچی شمشیریا! آخر اِن جھگڑوں میں کیا مفاد چھپا ہے۔ صلح کیوں نہیں کر لیتے تم۔''

''ہم صُلح کیوں کریں؟ ہم سندھوؤں کی چارپائی کے نیچے پیدا ہوئے ہیں کیا؟''

''وے، چور اور اُوپر سے چتر۔ تم نے میرے چاچے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور پھر اب کہتے ہو کہ ہم صلح کیوں کریں۔ صلح کر لینے سے بندہ چھوٹا تو نہیں ہو جاتا۔''

''ہم نے تیرے چچا کو قتل نہیں کیا، دھرم سے۔''

''تو اور فرشتوں نے کیا ہے۔ پر اڑیا! اب بھی تم صلح کر لو تو بہت فائدہ ہے۔''

''کیا فائدہ ہے؟'' شمشیر نے اُس کی بات پکڑی ''وے یہ دشمنیاں اور بیر ختم ہو جائیں گے اور دونوں گھر سُکھی بسیں گے۔'' روپو نے جلدی جلدی بات بدل دی۔

''اور روپو، ...... چھوڑ اِن باتوں کو، ہماری تمھاری جو صلح ہوگئی ہے تو آہستہ آہستہ بڑوں کی بھی ہو جائے گی۔''

''سچی مچی۔''

''ہاں''

اور وہ دونوں چپ کر گئے۔ جیسے کہنے کو کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو۔ گاؤں کی طرف سے راگی کے گانے کی مدھم مدھم آواز ابھی آ رہی تھی اور روپو کہنے لگی۔ اڑیا! اب چلیں، اُوپر سے دِن چڑھنے لگا ہے۔''

''ابھی تو بڑی رات پڑی ہے۔ گھڑی بھر اور ٹھہر جا۔''

''وے کل پھر سہی، میں نے رات بھر میں کہیں چلے تو نہیں جانا۔''

''تیرا کیا پتا ہے۔ عورتوں کا کیا اعتبار ہوتا ہے۔''

''وے نہیں شمشیریا!۔ میں اگر گئی تو تجھے بھی ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ اکیلی نہیں جاؤں گی۔'' روپو ہنس کر کہنے لگی۔

اور، وہ اُٹھ کے آہستہ آہستہ گاؤں کو چل پڑے۔

''تو سیدھی گھر چل اور میں ذرا اوپر سے ہو کر آؤں گا۔''

''اچھا'' اور روپو اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

دائرے میں ابھی اکھاڑا لگا ہوا تھا۔ یوں دِکھائی پڑتا تھا جیسے نہ تو ابھی جاٹوں کے پیسے ختم ہوئے ہیں نہ راگی کا گلا بیٹھا ہے۔ اور شمشیر گھر جا کے سو گیا۔

مہنداں نے ناشتا پکا کر ہر بچن کو آواز دی۔
ہر بچن سنگھ منہ ہاتھ دھو کر صحن میں آن بیٹھا۔
''وے شمشیر کو بھی جگا پتر'' مہنداں نے ہر بچن سے کہا۔
''نہیں بے بے اسے سو لینے دے۔ اسے رت جگا ہے اور کچھ کل کا بھی تھکا ہوا ہے''۔
ہر بچن نے جواب دیا۔
''واہگورو کی رکھ میرے پتر کو۔ میرا شمشیر تو ہیرا ہے ہیرا۔ واہگورو مجھے بہو بھی ایسی ہی دے کہیں سے تو بات ہے''۔ مہنداں شمشیر کو دیکھ کر کہنے لگی۔
''بے بے، اگر میری مانے تو شمشیر کی منگنی خالہ کی طرف ہی کر دے۔ لڑکی بھی خوب صورت ہے اور بات بھی گھر کی گھر میں رہے گی۔ اور ساتھ تو بھی کچھ کام کاج سے بچ جائے گی'' ہر بچن نے لسی کا مونگرا[1] پکڑتے ہوئے کہا۔
''وے پتر، کام کاج کے لیے اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے تو میں بڑی بہو لاؤں گی۔ تیرے پھوپھے سے بات پکی کر لی ہے وہ کہتا تھا کہ شادی ہاڑھ (جون) میں کر لو، تو جان لے کہ ہاڑھ میں، میں چاندی بہو گھر لاؤں گی''۔ مہنداں چاؤ بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

---

[1] پیالہ نما برتن۔

''تو بھی بے بے ڈھاکے بنگالے کی مارتی رہتی ہے۔ میں بات شمشیر کی کر رہا ہوں اور تو میری تاریخ پکی کر دے۔ اس بات کی اتنی بڑی کون سی جلدی ہے''۔

''ہے ہے وے چن، واہگورو کی برکت سے اب تو چھبیس کا ہو گیا ہے اور تو کہتا ہے کہ ابھی اتنی کون سی جلدی ہے۔ اور پھر تیرا پھوپھا کوٹھے جتنی بیٹی کو کب تک دہلیز پر بٹھائے رکھے اور اگر سچ پوچھو تو مجھ سے بھی اب اتنا بڑا گھر نہیں سنبھالا جاتا'' مہنداں کہنے لگی۔

''پر بے بے میں شمشیر کی بات کر رہا ہوں۔''

''وے بیٹے، پہلے تیری شادی سے تو فارغ ہو جائیں پھر شمشیر کی بھی سوچیں گے۔ شمشیر کون سا بوڑھا ہو چلا ہے۔''

''او بے بے کیا ہو گیا ہے تجھے۔ میں کب کہتا ہوں کہ کل ہی شادی کر دے شمشیر کی۔ میں تو کہتا ہوں کہ جب ایک اچھا بر ہاتھ میں ہے تو بات ہی پکی کر دے۔ منگنی کرنے میں کیا گناہ ہے۔'' ہربچن کے اونچی اونچی باتیں کرنے سے شمشیر کی آنکھ کھل گئی۔ اور اپنے بیاہ کے بارے میں ہونے والی باتیں سن کر اس نے جانتے بوجھتے خاموشی اختیار کر لی۔ بے بے کہنے لگی ''ہربچنیا! ابھی چار ماہ پہلے جب تیری خالہ یہاں آئی تھی تو اس نے میرے ساتھ تو کوئی بات نہیں کی تھی۔ تجھے یہ خواب کہاں سے آ گیا ہے۔''

''میرے ساتھ خالہ نے آپ یہ بات کی تھی۔ اور پھر بے بے، جندو کوئی ماڑی لڑکی نہیں ہے''۔ ہربچن نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

''وے نہیں ہربچنیا! میں کب کہتی ہوں کہ وہ ماڑی لڑکی ہے۔ جندو جیسی لڑکیاں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ جتنی اچھی شکل وصورت واہگورو نے اسے دے رکھی ہے، اتنی ہی میٹھی زبان ہے۔'' مہنداں کہنے لگی۔

''پھر۔''

''پھر کیا؟ تیرے بھائیے سے بات کروں گی۔ پر شمشیر کی مرضی بھی دیکھ لینا چاہیے۔'' مہنداں کہنے لگی۔

''شمشیر نہ نہیں کرتا بے بے۔ اس سے اچھی لڑکی تو ہمارے سارے خاندان میں بھی نہیں ہے۔ شمشیر کو راضی ہی سمجھو۔ اور تو بھائیے سے بات کر۔''

''اچھا۔''

اور ہر بچن اٹھ کر حویلی کو چل دیا۔ شمشیر اٹھا اور کیس اکٹھے کر کے جوڑا باندھ کر کہنے لگا۔
''بے بے، کیا باتیں ہو رہی تھیں ماں پتر میں''۔
''وے باتیں کیا ہونا ہیں شمشیریا! تیرے بھائی کے بیاہ کی باتیں کر رہے تھے۔ صلاح یہی ہے کہ ہاڑھ میں تیرے بھائی کی شادی کر دیں۔''
''ٹھیک ہے بے بے، ایسے نیک کام میں دیر نہ کر''۔
''وے پتر، مجھ سے اب بوڑھے ہاتھ نہیں چلائے جاتے۔ اور پھر اب گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوں۔ تم جیتے رہو اور گھر والیاں آ کے اپنا گھر بار سنبھال لیں اور ہمارے سروں سے بوجھ اترے'' مہنداں نے کہا۔
شمشیر خاموش رہا۔ اور مہنداں نے پھر گفتگو شروع کی۔'' وے شمشیریا! تجھے خالہ کے یہاں گئے ہوئے دو تین برس بیت چلے ہیں۔ کسی دن ہو آ۔ پاس ہی تو بالیاں ہیں۔''
''بھائی جومل آتا ہے مہینے پندرہ دن میں، میں نہ جاؤں تو کیا فرق پڑے گا''۔ شمشیر جل بھن کر کہنے لگا۔
''ہائے وے چن تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ ہر بچن کی کیا وہ زیادہ خالہ ہے۔ وہ سندیس بھیج دیتے ہیں اور ہر بچن کو جانا پڑتا ہے۔ پر تو بھی کسی دن ہو آ۔ تیری خالہ کا گلہ جاتا رہے گا۔''
''اچھا اچھا بے بے'' شمشیر بات ختم کر دینا چاہتا تھا۔
''کل ہی چلا جا۔ پرسوں لوٹ آنا۔''
''او اچھا بے بے! باتیں چھوڑ۔ روٹی کا لقمہ دے۔''

جیٹھ کے دہکتے دن تھے۔ شام پڑ رہی تھی پر ہوا ابھی تک گرم چل رہی تھی۔ شمشیر نے کندھے سے چادر اتار کے چہرے سے پسینہ پونچھا اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر تیز آواز میں پکارا۔

''اندر سیاں!''

''وے کون پتر؟'' اندر سے اندر سنگھ ورک کی ماں نے پوچھا، پھر اس نے دروازہ کھول دیا اور سامنے شمشیر کو پا کر کہنے لگی۔

''پتر شمشیر ہے۔ تو تو باہر کھڑا ہو کر یوں آوازیں دے رہا ہے جیسے کوئی بیگانہ ہو۔ یہ گھر کوئی پرایا ہے۔ اندر چلا آ پتر۔''

اور شمشیر اندر صحن میں چلا آیا۔

''اندر سنگھ کہاں ہے؟''

''حویلی تک گیا ہے ذرا۔ پر پتر! تو بیٹھ تو سہی، پانی دھانی پی، وہ آتا ہی ہوگا۔'' اور اندر کی بے بے دودھ کا بڑا کمنڈل بھر لائی۔

''تیری ماں کیسی ہے۔''

''وہ راضی خوشی ہے ماسی۔''

''وے راضی خوشی اس نے کیا ہونا ہے پتر۔ بھائی اجاگر سنگھ کی موت نے تو اس کی کمر توڑ دی ہے۔

''مرنا جینا تو واہگورو کے اختیار میں ہے چاچی۔ اس کے آگے بندے کی کب چلتی ہے''۔ شمشیر نے افسردگی سے کہا۔

وہ شمشیر کے کندھے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''پی بیٹے، دودھ تو پی۔'' اس دوران اندر بھی آ گیا۔

''اوئے بلے بلے، آج سردار شمشیر سنگھ کدھر راستہ بھول پڑا ہے''۔ اندر، شمشیر کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ کے خوشی سے کہنے لگا۔ ''او یار، تو تو ملنے سے بھی گیا۔ صرف چار ایکڑ کا فاصلہ ہے بیچ میں پر تو کبھی۔''

''او، نہیں یار اندر سنگھا! بھائیے کی موت کے بعد وہ پہلی سی بات تو نہیں ناں۔ کچھ کام کاج بھی کرنا پڑتا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ پھر تو بھی کب آیا ہے؟'' شمشیر نے ناراضگی سے کہا۔

تو تو جانتا ہی ہے بھائی شمشیر! میں اکیلا بندہ ہوں۔ جب کبھی باہر جانا پڑتا ہے نوکر اچھی طرح جانوروں کو چارہ پانی ہی نہیں دیتے۔'' اندر نے کہا۔ ''آ، ذرا حویلی چل کے آرام سے بیٹھتے ہیں۔''

''چلو'' اور وہ دونوں اٹھ کر حویلی کو چل پڑے۔

''بھائی تیرے کا کیا حال احوال ہے؟''

''بھائی کی چھوڑ اندر! آج کوئی اور بات کر۔''

''کیوں بھلا؟''

''اوئے چھوڑ بھی اب یار''۔

''کوئی نشہ پانی کریں گے۔''

''یار گرمی بہت ہے۔ پر اب تو لے ہی آ، شراب کے سوا ہمارا اب کیا سہارا ہے''۔ شمشیر نے بے دلی سے کہا۔

''اوئے رب رب کر، اوئے شمشیر سنگھا۔ کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگا ہے۔'' اور اندر سنگھ ایک بوتل اور دو گلاس لے آیا۔

''او بیٹھ جا یار پانی کا کیا کرنا ہے۔ جب جوانی ہی جلانا ہے تو پھر پانی کس لیے۔ ایسے ہی پی''، شمشیر نے کہا۔ اور اس نے پگڑی اتار کر چار پائی کے پائے پر ٹانگ دی اور بوتل کھول کر گلاسوں میں ڈالنے لگا۔ گلاس آدھے آدھے کر کے اس نے ایک گلاس اندر کو دے دیا اور دوسرا آدھا گلاس ایک ہی سانس میں یوں پی گیا جیسے وہ تلخ شراب نہ ہو شربت ہو۔ دوسرا پی کے شمشیر سنگھ کچھ کچھ خمار میں آ گیا اور پھر وہ تیسرا گلاس بھی آدھا کر کے چڑھا گیا۔ اندر سنگھ اس کے یوں پینے سے حیرت زدہ تھا۔

''اوئے سہجے سہجے پی شمشیر سنگھا! یہ پہلے توڑ کی بوتل ہے''۔

شمشیر سنگھ نے اپنی داڑھی پر پڑے قطرے پونچھے، اندر سنگھ کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے دل پر ہاتھ مار کے کہنے لگا۔

''اوئے اندر! یہاں آگ لگی ہے اور آگ کا علاج آگ ہی ہے۔ اوئے تو کیا جانے؟ میں اس آگ میں کس طرح جل رہا ہوں۔ اوئے، اب تو یہ آگ میری روح کو بھی بھسم کیے جا رہی ہے، اِندر!''

''کون سی آگ اور کس درد کی آگ''؟

''یہ کیسی آگ ہے اِندر! یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، پر آگ ہی آگ ہے میرے چار سو۔ اِندر! اب شکتی اور مکتی کی سبھی راہیں بند ہیں۔ سب راستوں پر یہ آگ ہے اور یہ آگ میرے من میں ہے۔ یہ مجھے اندر ہی اندر جلا رہی ہے۔'' شمشیر کی آواز میں انت کی پیڑا تھی۔

''او کیسی بجھارتیں بجھوا رہا ہے، بات کا کوئی سر، پیر بھی میرے ہاتھ دے، بھائی''۔

''کیا بتاؤں تجھے اِندر سنگھا! بات کر لینے سے بھی دکھ کی آگ بجھتی ہے کبھی؟ پھر باتوں کا کیا حاصل؟'' شمشیر جوتا اتار کر چار پائی پر نٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہر بندہ آپ ہی آپ اپنے دوزخ میں جلتا ہے۔ بات کرے یا خاموش رہے۔ اور جب باتیں کر لینے سے کوئی نفع نقصان نہیں ملنا تو پھر اپنے دکھڑے رونے سے کیا حاصل، اِندر سنگھا!''

تب اِندر نے چاند کی روشنی میں اس کی سرخ سرخ جلتی آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں بہت درد کی کسک تھی، کسی گہرے دکھ کی تڑپ! اِندر سنگھ، حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اب اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ وہی شمشیر سنگھ ہے جو ایک من موجی، جی دار اور

ہنس مکھ بندہ تھا اور جس نے کبھی کسی بات کی فکر اور چنتا نہ کی تھی۔ اور اب جو شمشیر سنگھ اس کے سامنے تھا وہ مجسمہ غم، دردوں، آہوں، پیڑوں اور غموں سے بھرا وجود تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں، وہ کتنا بدل گیا تھا۔ واہ رب سچے! تو بھی کیا کیا روپ دکھاتا ہے۔ اندر سنگھ نے سوچا! ابھی پچھلے ہاڑھ، جیٹھ کی بات ہے جب ہربچن سنگھ رندھاوے کی جنج چڑھی۔ اور شمشیر پہلے کی طرح اچھا بھلا۔ ساری جنج کی شناخت تھا وہ لڑکا، لوگ بڑھ بڑھ کر جنج کو دیکھتے تھے اور ہر نظر جا کے شمشیر پر ٹھہرتی۔

''واہگورو نے بڑا روپ دیا ہے جوان کو''۔

''بڑی ہی جان کمائی ہے جوان نے۔''

''بڑا ستھرا جوان ہے''۔

جنج میں کوئی دو سو کے قریب گھوڑی تھی۔ جنج چلنے لگی تو مہنداں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہربچن کا ماتھا چوم کر کہنے لگی۔ ''پترا! تیرا باپ آج زندہ ہوتا تو کتنی خوشی ہوتی اسے''۔ پاس کھڑا حاکو کھرل بول پڑا ''بہن دل چھوٹا نہ کر۔ بھائی اُجاگر سنگھ کی پیٹھ سخت ہے۔ مجھے یہ بچے اپنے بچوں سے بھی عزیز ہیں۔''

ہربچن سنگھ گھوڑے پر چڑھا۔ ابرق اور مایا لگی پگڑی پر بندھا سہرا، اس نے پیچھے پگڑی پر الٹ لیا اور اپنے بگّے گھوڑے کو تھپکی دے کر کہنے لگا۔

''صبر اوئے پتر، صبر۔''

اور جلد بازی میں مصروف گھوڑا جیسے سمجھ گیا۔

''چاچا چلو بھی اب۔ دھوپ چڑھ رہی ہے۔ سفر بہت ہے۔'' یہ شمشیر سنگھ تھا۔ وہ اپنے باپ والی گھوڑی پر سوار تھا۔ لینن کی چادر اور بوسکی کے کرتے پر مایا لگی کیسری پگڑی باندھے بڑا چھیل چھبیلا جوان دکھائی پڑتا تھا۔ کندھے پر ریشمی چادر اور گلے میں کنٹھا۔

وہ حقیقتاً بہت پھب رہا تھا۔ گھوڑی کے قریب آ کے مجھ سے کہنے لگا۔

''یار چلتے نہیں''۔

''اچھا بھائی، کھو، کہیں سرکار آپ چلے تھے اور کہہ ہم سے رہے ہو۔''

''اوئے میں تو اپنی صاحباں کو دیکھنے گیا تھا ذرا''۔ اس نے میرے کان کے قریب آ کے سرگوشی کی تھی۔

جنج چل پڑی۔ شمشیر سنگھ بڑا خوش تھا۔ ایک ایک جوان اور بزرگ سے وہ مذاق کر رہا تھا۔ آگے ہر بچن اور حاکو کھرل دھیرے دھیرے گھوڑیاں لیے جا رہے تھے۔ اور ان سے ذرا ہٹ کر پیچھے پیچھے میں اور شمشیر ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

میں نے شمشیر کو چھیڑا ''مزہ تو تب آئے گا جب تیری جنج جائے گی۔''

میری جنج پر تو ہاتھ میں کرپانیں اور سروں پر منڈاسے باندھ کے جاؤ گے، بیٹا! اس کے لیے ذرا جانیں جونیں بنالو۔'' وہ ہنس کر کہنے لگا۔ پھر اچانک خاموش ہوگیا اور میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا سوچتا ہے شمشیریا!''

''میں سوچ رہا ہوں کہ جانے کتنے قتل ہوں گے''۔

''او، چھوڑ، جانے دے یار! کوئی عقل کی بات کر۔''

''دیکھنا! تو بھی یہاں ہے اور میں بھی۔''

''اوئے تو ہی انسان بن جا۔ چھوڑ روپو میں کیا رکھا ہے۔ احق ساتھ ہمیں بھی مروائے گا۔''

اور شمشیر کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے بھر گئے۔

''اِندر! یہ بات اب تو بھی کرنے لگا ہے۔ خون، قتل کا نام سن کر ہی ڈر گیا ہے، اوئے میں جو کام کرتا ہوں وہ اپنے سر، اپنے بازو کے زور پر کرتا ہوں۔ یاروں، سجنوں کی آس پر نہیں۔''

میں تو مذاق کر رہا تھا شمشیریا! میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ تجھے ضرورت پڑے تو بوڑھوں اور جوان سب ورکوں کا لہو حاضر ہے۔''

اور میں نے ٹھیک کہا تھا۔ شمشیر کو بھی اس میں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اور گاؤں پہنچنے تک شمشیر سنگھ کسی گہری سوچ میں غرق رہا تھا۔

حاکو کھرل اور دین محمد چادر کی جھولیوں میں سے مٹھیاں بھر بھر پیسے پھینکنے میں لگے تھے۔ گاؤں کے ایانے، بچے، پیسے ڈھونڈنے کے لیے گھوڑیوں کے نیچے چلے گئے۔ الھڑ مٹیاریں اور بڑی بوڑھیاں گھروں کے بنیروں پر کھڑی جنج دیکھ رہی تھیں۔

''وہ لڑکا ہے۔''

''اور وہ تیکھا گھبرو لڑکے کا بھائی ہے۔''

اور میں نے دیکھا کہ مُیاریں بڑی گہری نظروں سے شمشیر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور دین محمد نے چار پانچ مٹھیاں بھر کے مکانوں کی چھتوں پر بھی پیسے پھینک دیے تھے۔

''تمھارے پاس زیادہ پیسے ہیں بھائی۔'' اوپر سے کسی مُیار نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''رندھاوے جنج میں آئے ہیں اڑیے! کوئی مذاق ہے۔'' دوسری نے ہنس کر کہا۔

''اوئے اوپر دیکھ شمشیر سیہاں!'' میں نے شمشیر سے کہا جو سر نیہوڑائے گھوڑی پر بیٹھا تھا۔ اور وہ کچھ نہیں بولا۔ اور اس کے بعد اس نے کبھی میرا سامنا نہ کیا۔ گویا ناراض ہی ہوگیا تھا۔ دو ایک بار میں اس کے یہاں گیا بھی، پر اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے اور از حد غصے میں ہے۔ پر میں اس کے بارے میں ادھر ادھر سے بہت باتیں سنتا رہا تھا۔ باپو کے مرتے ہی میں نے سنا کہ ایشر ڈکیت جب دس برس جیل میں گزار کے آیا تو شمشیر سنگھ کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوگیا۔ اور وہ اس گروہ کے ساتھ مل کر چوریاں، ڈاکے مارنے لگا۔ بہت دلیری اور حوصلے والا تھا اس لیے کچھ ہی عرصے میں ہر طرف '' شمشیر سنگھ، شمشیر سنگھ'' کی ہاہا کار مچ گئی۔ پھر سنا کہ وہ گاؤں میں بھی کم ہی رہتا ہے۔ اور پھر نہ جانے وہ کہاں تھا۔ اور آج وہی شمشیر میرے سامنے بیٹھا یوں شراب پی رہا تھا جس طرح پیاسے گرمی میں ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔

وہ چپ چاپ شراب پی رہا تھا ایک بوتل ختم ہوگئی تو اس نے کہا۔'' اِندر! شراب اور ہوگی؟''

''ہاں! پر میرے بھائی، تو بہت پی چکا ہے۔''

''نہیں یار ہے تو اور لے آ۔ بہت دیر بعد آج جی بھر کے پینے لگا ہوں۔'' اس نے اِندر کی بات کاٹ کر کہا۔ اور اِندر سنگھ نئی بوتل نکال لایا۔

''لے بھائی''۔

اور شمشیر نے خاموشی سے بوتل پکڑ لی۔ اور گلاس میں ڈال کے پینے لگا۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ پینے والوں میں سے تھا پر پہلے توڑ کی پوری بوتل پی کر بھی عقل اور سوجھ کی باتیں کرنا ہر ایرے غیرے کا کام نہیں تھا اور وہ تو ابھی تک پیے جا رہا تھا۔

کوئی بات ہی کر شمشیر سنگھا!'' اِندر نے دو چار گھونٹ پی کر کہا۔

''بات کیا کروں اِندر! پیٹ سے کپڑا ہٹائیں تو اپنا آپ ہی ننگا دکھائی دیتا ہے۔ واہگورو مجھے معاف کرے، میں بڑا پاپی ہوں اِندر سنگھا''۔ شمشیر روہانسے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔

''اوئے پاپ اور پن کوئی علیحدہ علیحدہ چیزوں کے نام نہیں۔ ایک ہی چیز کو ہم پاپ کہتے ہیں اور اسی کو ہی پن۔ لوگ ضرورت موجب پاپ کو پن بنالیتے ہیں اور پن کو پاپ۔''

اِندر سنگھ سے شراب باتیں کروا رہی تھی۔ وہ جب پیے ہوتا تب بہت دانائی کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے پھر بات شروع کی۔ ''اور تو جس بات کو پاپ کہتا ہے ممکن ہے وہی پن کی بات ہو، پر یہ پاپ اور پن کی باتیں تو عورتوں کے کرنے کی ہوتی ہیں، اگر تو کہے تو میں بھی ایک بات کروں شمشیر سنگھا۔''

''کر، میں نے تجھے کب روکا ہے'' شمشیر کہنے لگا۔

''غصّے تو نہیں ہوگا۔ میں نے پہلے بھی بات مذاق میں کہی تھی اور تو غصّے ہوگیا تھا اور آج برسوں بعد آن ملا ہے۔''

''اوئے وہ کون منکھ ہے جس نے تجھے اتنا عاجز کر دیا ہے؟''

تیرھویں کا چاند حویلی کی دیوار پھلانگ کر اونچا ہو رہا تھا اور شمشیر سنگھ کی آنکھیں نشے سے سرخ ہو کر چڑھ گئی تھیں اور وہ یوں افسردہ بیٹھا تھا جس طرح اس کا کوئی سجن مرگیا ہو۔ اور وہ پھر کہنے لگا۔

''بندہ کون ہے مجھے عاجز کرنے والا؟ اوئے اِندر! میرے اندر کا انسان مجھے سانس نہیں لینے دے رہا۔ وہ مجھے برچھیاں مارتا رہتا ہے اور میرے بدن کو ٹوکے سے ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہتا ہے۔ اوئے میں ہر بندے کو دھوکا دے سکتا ہوں پر اپنے اندر والے کو نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ ہم ہر بندے کو مار سکتے ہیں پر اپنے اندر والے کو نہیں اور وہ بندہ بڑا ظالم ہے اِندر! وہ ہمارا رائی برابر گناہ بھی نہیں معاف کرتا۔''

اِندر سنگھ آہستہ سے بولا۔ ''اور جندو!''

اور شمشیر سنگھ کے ہاتھوں سے خالی گلاس چھوٹ گیا۔ کندھے کی چادر سے اس نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ کچھ سنبھلا اور کہنے لگا۔

''لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''لوگوں کی بات مت کر۔ لوگ بھی کبھی ایک بات کیا کرتے ہیں، جتنے منہ اتنی باتیں،

کے سچ تسلیم کریں اور کس کو جھوٹ کہیں۔تو، بھی تو بتا کچھ''۔ اِندر سنگھ نے شمشیر کی آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں شعلے دہک رہے تھے۔ پانی کی ایک بڑی سی لہر آئی اور آگ کے اوپر سے گزر گئی اور اس نے آنکھیں میچ لیں اور پھر وہ بولا، جیسے کوئی گہرے کنویں میں سے باہر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو'' واہگورو مجھے معاف کرے، میں بڑا پاپی ہوں'' یوں دکھائی دیتا تھا جس طرح وہ اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا ہو۔

''بات کر، اس طرح تیرے دل کا بوجھ اتر جائے گا۔'' اِندر سنگھ کہنے لگا۔

''اوئے جھلّے'' شمشیر کہنے لگا۔'' اگر دلوں کے بوجھ باتوں سے کم ہوسکتے تو کبھی کسی کے دل پر بوجھ کا پتھر نہ پڑا رہتا۔ پر، تو نے یہ جندو کی کہانی کیوں چھیڑ دی ہے؟''

'' کیوں نہ چھیڑتا؟ ایک تو اور دوسرا بھائی ہربچن دو ہی تو ایسے بندے تھے جن سے یہ بات کرنے کا سوال اٹھتا ہے۔ اور ہربچن سنگھ سے جب میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگا ''اپنے یار کو پوچھ جا کے۔ اور تو اب بات کر۔''

''بات''۔ شمشیر سنگھ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اِندر سنگھ سہم گیا، جس طرح برستی برکھا میں بجلی کڑکنے سے بچے خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ وہ ڈر گیا، معلوم نہیں یہ زیادہ شراب پینے کا اثر تھا یا۔ یا کیا بھئی۔ اِندر سنگھ کو یوں لگا جیسے شمشیر بھول کر ہنس پڑا ہو۔ اس نے شمشیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ پھر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا۔ وہ رویا تو نہیں، لیکن اس کی آواز روتی ہوئی تھی۔ جیسے وہ اپنے آپ سے محوِ گفتگو ہو۔

''تو جانتا ہے ہمارے گھر والے میری منگنی جندو کے ساتھ کرنے کی فکر میں تھے اور ان میں جو سب سے پیش پیش تھا وہ بھاؤ ہربچن تھا۔ پہلے تو یہ باتیں دبی دبی زبان سے ہوتی تھیں پر باپ کے مرنے کے بعد تو یہ بات بے بے نے مجھ سے صاف کہہ دی۔ میں نے ''نہ'' کردی۔ اس رات مجھے بھاؤ آ کر سمجھانے لگا۔ میں غصے میں آ گیا اور میں نے اس سے کہا'' بھائی میاں جس کا بوجھ ہے وہ آپ ہی اٹھائے، مجھے کیوں پھنسانے لگا ہے۔اور بھائی نے مجھے تھپڑ جڑ دیا۔ وہ غصے سے لال سرخ ہوگیا تھا اور پھر وہ اٹھ کے باہر چلا گیا''۔

'' پر تو نے یہ بات کیوں کی شمشیر سنگھا؟'' اِندر سنگھ کہنے لگا۔

''سنتا جا۔'' اور شمشیر سنگھ بولنے لگا۔'' بھاؤ کا ہر دوسرے چوتھے روز خالہ کے گاؤں جانا۔ اور اس کا اور جندو کا ہنس ہنس کر باتیں کرنا۔ پھر گھر میں بے بے اور بھاؤ کی آہستہ آہستہ

باتیں کرنا اور بھاؤ کا چپ چپیتے مجھے دیکھتے رہنا۔ مجھے سب یوں لگتا تھا جیسے بھاؤ اور بے بے ، جندو کے ساتھ مل کر میرے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہوں اور پھر۔ مجھے بھاؤ اور جندو کے میل ملاپ پر بھی شک تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بھائی اپنی بلا میرے سر منڈھنا چاہتا ہے اور ایک دن میں نے اس سے صاف کہہ دیا ''بھائی جس کا بوجھ ہے آپ ہی اٹھائے۔'' اس دن تو بھائی چپ چاپ باہر چلا گیا پر اس سے اگلے دن میں نے وہی بات دہرا دی اور بھائی اندر سے کرپان اٹھا لایا۔ میرے ہاتھ گڈے کا منا آ گیا اور ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ تو بے بے اور چاچے حاکو نے بیچ میں پڑ کے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ نہیں تو جانے کیا ہو جاتا۔ اور اس کے بعد بھائی نے میرے ساتھ بات چیت بند کر دی۔

بے بے نے میری منگنی زبردستی کر دی۔ میں نے اس سے ہزار بار کہا کہ یہ بات سرے نہیں چڑھے گی پر بے بے بھی اپنی ضد پر اڑ گئی اور میری منگنی جندو کے ساتھ طے کر دی گئی۔

اس رات میں مڑھیوں میں روپو کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نہ آئی۔ رات آدھی بیت گئی۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں گاؤں والے راستے پر مجھے ایک سایہ دکھائی پڑا۔ ''روپو'' میں نے آہستہ سے آواز دی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ سایہ میرے پاس آ کے ٹھہر گیا۔ وہ حاکاں مچھانی تھی جو کبھی کبھی میرا پیغام روپو اور روپو کا پیغام میرے لیے لایا، لے جایا کرتی تھی۔

''روپو کہاں ہے حاکاں؟''

''اپنے گھر۔''

''کوئی پیغام۔''

''تیری منگنی کی مبارک باد بھیجی ہے۔''

''اسے کیسے علم ہوا؟''

''گاؤں میں یہ بات کون نہیں جانتا۔''

''اچھا، پر اسے کہنا میری بات تو سن جائے۔''

''نہیں سردار اس نے نہیں آنا۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی تھی۔''

''کیا کہتی تھی؟''

''وہ کہتی تھی کہ اب میرا انتظار نہ کیا کر۔''

''اچھا۔''

''ہاں۔ اور لو اب میں چلتی ہوں۔''

''بات سن، اس سے کہنا۔''

''کیا کہوں اس سے۔'' حاکاں پلٹ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''اسے کہنا کہ اگر اونٹوں سے یارانے لگانے ہوں تو دروازے بھی بڑے رکھتے ہیں۔''

''بس''

''بس''

اور حاکاں مچھانی گاؤں کو چل پڑی۔

دوسرے دن جب بھائی حویلی سے گھوڑا نکال کر گھر سونے چلا گیا تو میں نے اپنی گھوڑی پر کاٹھی ڈالی۔ خلقت سو چکی تھی اور میں نے گھوڑی گاؤں سے نکال کر اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑی قدم قدم چل رہی تھی۔ خالہ کا گاؤں دو کوس دور تھا۔ باہر والے اجاڑ باغ میں میں نے گھوڑی سائے میں باندھ دی۔ پھر میں گاؤں میں داخل ہو گیا۔ رات کافی بیت چلی تھی۔

صحن کی دیوار پھلانگ کر میں اندر چلا گیا۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک خالہ کی اور دوسری جندو کی۔ چاند کی ہلکی روشنی میں، میں نے جندو کی چارپائی پہچان لی۔ وہ ابھی جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ حیرت زدہ سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''گاؤں میں تو سب خیر ہے؟''

میں نے انگلی منہ پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی میری کرپان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ان کی طرف کبھی دو چار برسوں بعد جایا کرتا تھا وہ بھی تب کہ خالہ نے پچاس ساٹھ پیغام بھجوا دیے ہوتے۔ اور اس رات منگنی کے صرف تین دنوں بعد جندو مجھے دیکھ کر حیران نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔ ساتھ والی چارپائی پر خالہ گہری نیند میں مدہوش تھی۔

''تجھ سے ایک بات کرنی ہے، جندو۔''

''بیٹھ تو جا! میں پہلے تجھے بستر تو بچھا دوں''۔

''نہیں۔ نہ بیٹھنے کی ضرورت ہے نہ چارپائی کی۔ میں نے ابھی لوٹ جانا ہے۔ تو کچھ دیر کے لیے ذرا باہر آ۔''

''باہر؟''

''ہاں۔''

اور میں آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھول کے باہر نکل آیا۔ میرے پیچھے پیچھے جندو بھی چلی آ رہی تھی۔ گاؤں سے باہر نکل کے میں ٹھہر گیا۔ وہ میرے پاس آ گئی۔ اس نے کھدر کی سفید چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔

''خیر تو ہے'' اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

''خیر ہے۔''

''بے بے جی کا کیا حال تھا؟''

باغ میں آ کر ہم گھوڑی کے پاس ٹھہر گئے۔

''گھوڑی یہاں کیوں باندھی ہے۔ اگر کوئی لے جاتا تو۔''

وہ بڑی معصوم باتیں کر رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ میرے گلے سے تھوک نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ میں متذبذب تھا کہ بات کروں تو کیا کروں۔ میرے سامنے جندو کا گلاب کی مانند خوب صورت چہرہ تھا۔ جو ہلکی ہلکی روشنی میں اور زیادہ حسین دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات تھی۔ بتاؤ''۔

پر میں کیا بات کرتا۔ مجھے تو میرے اندر والا بندہ ہی بات نہیں کرنے دے رہا تھا۔ میں بار بار تلوار کے دستے کو اپنی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑتا اور میری مٹھی پسینے سے بھیگ جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔ اس سے پہلے تو بڑے سے بڑے نازک موقعے پر بھی میرا ہاتھ نہیں کانپا تھا۔ ''کیا بات تھی۔ کیا سوچتے ہو۔ پر تم ٹھیک تو ہو؟''

شاید، اس نے چاند کی روشنی میں میرے ماتھے پر آتا پسینہ اور میرے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے آخری بار تلوار کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ ڈالا۔ جندو کو میں نے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ دور کھڑے مجھے اس کی آنکھوں سے دہشت آ رہی تھی۔ وہ چھوئی موئی سی میرے ساتھ لگ گئی۔ گرم نرم، روئی سے بدن اور جوانی کے پسینے کی مہک نے مجھے وہ نشہ دیا جو روپو کے پاس تھا ہی نہیں۔ میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کے اس کا ماتھا چوما۔ اس کے ماتھے کا گرم، نمکین پسینہ میرے ہونٹوں سے یوں چھوا جیسے سخر دوپہر کسی پیاسے مسافر کو ڈیک لگا پانی پی

کر مزہ آتا ہے۔ اور پھر روپو میرے روبہ رو آن کھڑی ہوئی۔ مجھے وہ منصوبہ یاد آیا، جسے تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں گاؤں سے آیا تھا۔ دھکا دے کر میں نے جندو کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ وہ سہمی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میرا بھی حلق خشک ہو گیا۔ کرپان کے دستے پر مٹھی اور زیادہ کس گئی۔ کرپان ابھری اور جندو کا سر دھڑ سے علیحدہ ہوا پڑا تھا اور لہو کے فوارے چل رہے تھے۔ میں گھوڑی پر بیٹھا، اسے ایڑ لگائی۔ گھوڑی ہوا ہو گئی۔ میرا رخ اپنے گاؤں کی جانب تھا اور میرے سامنے جندو کا سرخ گلاب کے پھول سا چہرہ اڑا چلا جا رہا تھا اور اس کی تیکھی نظریں میرے دل میں پیوست ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

''کیا بات تھی۔ بات کرو۔''

''کیا بات تھی۔ بات کرو۔''

ہوا کی تیز سیٹیوں کے ساتھ ساتھ جندو کی مدھم مدھم آواز میرے کانوں سے گزر کے میرے دل میں تیر کی مانند چبھتی جا رہی تھی۔ حویلی کے سامنے آ کے میں نے گھوڑی روک دی۔

''پھر روپو کو تو نے بتایا؟'' اِندر سنگھ کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔

''نہیں۔ تو پہلا انسان ہے جس کے ساتھ میں نے یہ بات کی ہے۔''

''بھائی تیرا جانتا ہے۔''

''ہاں! بھائی کی چپ چاپ اور گہری نگاہیں مجھ سے ہمیشہ یہی کہتی ہیں۔ 'ہمیں خبر ہے، ہم جانتے ہیں۔' پر کیا ہوا اگر اسے علم ہے تو؟''

''ہوں، تو بات کر۔''، پھر اِندر سنگھ نے دہرایا۔

''پھر ایک رات۔ پچھلی سردیوں کی بات ہے۔ روپو، حویلی آئی ہوئی تھی۔ میں نے بتایا نا کہ جب سے باپو مرا ہے بھائی آپ بھی گھر سوتا ہے اور گھوڑا بھی گھر ہی باندھتا ہے اور حویلی میں، میں اور نکا عیسائی ہوتے ہیں۔ علی الصباح روپو میرے پاس حویلی سے ہو کر جا رہی تھی۔ بہت سردی تھی اس روز اور کچھ مجھے نیند بھی آ رہی تھی جو میں اسے دور تک چھوڑنے نہ جا سکا۔ روپو ابھی حویلی کے بڑے دروازے سے ہی گزری تھی کہ سامنے سے بھائی آ رہا تھا۔ اس نے روپو کو روک لیا۔

''لڑکی اپنے گھر کی نہیں تو کچھ ہماری عزت کا ہی سوچ لے۔''

۱؎ ایک برساتی نالہ

اور یوں بھائی کو اس روز میرے اور روپو کے تعلقات کا پتا چل گیا۔

اگلے دن چاچا جاکو مجھے سمجھانے آیا۔ اسے بھائی نے بھیجا تھا۔ وہی پرانی باتیں کرتا تھا چاچا جاکو۔ یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا۔ قتل ہو جائیں گے۔ بھائی لاکھوں میں ہاتھ نہیں آتے۔''

''اوئے ہاں شمشیر سنگھا! بھائی لاکھوں میں بھی ہاتھ نہیں آتے۔'' اِندر سنگھ نے کہا۔ ''عورتوں کا قحط نہیں۔ بندے میں لہو ہو تو عورتیں پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں۔ پر مورکھا، بھائی نہیں ملتے پھر۔ اور پھر ہربچن سنگھ جیسے بھائی۔ اوئے تو پتھر کے بدلے میں ہیرا کھو رہا ہے۔''

''اوئے چھوڑ ان باتوں کو اِندرا۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا ہے۔ اب نہ ہربچن مجھے بھائی سمجھتا ہے نہ میں اسے۔''

''تمھاری صلح کروا دیتے ہیں۔ اوئے، تمھارے علیحدہ علیحدہ ہوجانے سے پورا گھر ختم ہوجائے گا شمشیر سنگھا۔''

''نہیں اندرا، جب ایک بار دلوں میں فاصلے پیدا ہوجائیں پھر صلح کبھی نہیں ہوتی اور بھائی سے صلح کی ایک ہی صورت ہے''۔

''کیا؟'' اِندر سنگھ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کہ میں روپو کو چھوڑ دوں۔''

''تو چھوڑ دے۔''

''اوئے تمھاری عقل تو قائم ہے اِندر۔ اب جب ساری دنیا میں اس بات کا نقارہ بج چکا ہے میں کس منہ سے اسے چھوڑ دوں۔ اور روپو کی ڈولی کسی اور کے ساتھ کیسے جانے دوں۔ اوئے میں مرد ہوں، اور میں نے روپو کو قول دیا ہے۔ اب چاہے ساری دنیا ہی پھر جائے میں نے قول نہیں ہارنا۔ تو ایک ہربچن کی بات کرتا ہے میرے راستے میں تو ایک سو ہربچن بھی آجائیں تو میں...... '' شمشیر سنگھ جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اوئے تیرا تو خون ہی سفید ہوگیا ہے شمشیر سنگھا۔ کبھی بھائی بھائی کے لہو کا پیاسا نہیں ہوا۔ کچھ تو عقل کر۔''

''مجھے نہیں معلوم اِندر سنگھا، عقل کیا ہوتی ہے۔ پر میں ایک بات ضرور جانتا ہوں کہ چاہے میرے راستے میں ساری دنیا آجائے، دیوار بن جائے۔ میں نے روپو کو نہیں چھوڑنا''۔

''بھائی دل کی پوچھے تو حق بھی یہی بنتا ہے۔ میں تو تیری اور ہر بچن کی لڑائی کی وجہ سے کہتا ہوں، نہیں تو روپو کی تو باتیں ہی سن سن کر بندہ حیران ہو جاتا ہے۔ بڑی دلیر عورت ہے بھائی۔'' اندر سنگھ کہنے لگا۔

''ہاں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ جب ہمارے بارے میں مشہور ہوا اور اس کے بھائیوں نے اس سے پوچھا تو اس نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔ ہاں، ٹھیک ہے میں نے تو اس کے گھر ہی بسنا ہے۔ اور قسم گورو کی وہ تو علی الاعلان کہتی ہے اگر بسوں گی تو صرف شمشیر کے گھر۔ اس کی ہڈیاں انھوں نے مار مار کے توڑ دی ہیں پر وہ نہیں ہارتی۔ اوئے پچی پچی وہ بڑے دل گردے والی عورت ہے اندر'' شمشیر سنگھ کہنے لگا۔

''ایسے ہی سنا ہے میں نے بھی۔ پر لوگ کہتے ہیں وہ لوگ کہیں اس کی منگنی کر رہے ہیں''۔

''کر نہیں رہے کر دی ہے۔''

''کہاں؟'' اندر سنگھ نے حیرت سے کہا۔

''پنڈوری۔ تیجا سنگھ باجوا کے چھوٹے لڑکے کے ساتھ''۔

''اور بیاہ کب ہے؟''

''اگلے چاند کی پہلی کو بارات آئے گی!''

''تو، تو کس انتظار میں ہے اب؟''

''چاند کی پہلی کی''۔

''کیوں''؟

میں کہتا ہوں اگر میرے ساتھ دو بازو ہوتے تو میں باجوؤں کو راستے ڈال دیتا''۔

''کیسے؟''

''دن دہاڑے جنج روک کے۔ میں ان کو یہ بتا دیتا کہ سورمے عورت کو چوروں کی طرح نہیں بھگاتے۔ دن دہاڑے چھین لیتے ہیں''۔ شمشیر سنگھ کی آنکھیں بہت ڈراؤنی ہو گئی تھیں۔

''پر یہ کام عقل کا نہیں۔ جب ایک کام خاموشی سے ہو جائے تو پھر کھپ ڈالنے کا اور خون خرابہ کرنے کا کیا فائدہ۔ پر تو روپو کو لے کر کہاں جائے گا؟''

''یہ ابھی دور کی باتیں ہیں۔ وقت آنے دو، پھر بتاؤں گا۔''

''چاند کی پہلی والی بات تو پھر طے ہے نا۔''

''ہاں پتھر پر لکیر۔''

''میں شام ہوتے ہی تیرے پاس آجاؤں گا۔ پھر جو واہگورو کرے۔''

''اچھا۔'' اور شمشیر نے پگڑی دُرست کر کے باندھی اور روٹی کھائے بغیر ہی چل پڑا۔

اُس روز چاند کی پہلی تھی۔ سردار کرتار سنگھ سندھو کی حویلی میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شام کے سمے سردار کرتار سنگھ نے اپنے پسار[1] میں کھڑے ہوکر خوب ڈھلے کپڑے پہنے، سفید پگڑی باندھی اور اپنے چھوٹے بیٹے سے پوچھا!

''ابھی جج تو نہیں آتی نظر آ رہی کہیں؟''

''نہیں چاچا۔''

''اوئے راجندرا! اِدھر آ۔'' اُس نے لڑکے کو پاس بلایا اور آہستہ سے کہنے لگا۔''اوئے! اُس ماں کے خصم کا بھی خیال رکھنا کہیں گڑ بڑ ہی نہ کر دے۔''

''نہیں چاچا! ہم تو خود اُس کے انتظار میں ہیں۔ پر وہ تو پرسوں کا گاؤں ہی چھوڑ کر بھاگ چُکا ہے۔ اِدھر سے فارغ ہولیں تو اُس سے بھی نبٹ لیتے ہیں۔ ہم نے خاموش رہ کر بھی بہت دیکھ لیا ہے۔ پر وہ ہمارے ساتھ ہاتھ کرنے سے نہیں باز آتے۔''

اور یہ بات اُڑتی اُڑتی کہیں روپو کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ سب سے پچھلے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اسے یوں لگا جیسے شمشیر اُسے اندھے کنویں میں دھکّا دے کر چلا گیا ہو۔'' وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کیوں چلا گیا ہے۔'' اور اُس کے آنسو پسینے میں بھیگتے رہے۔ بہتے رہے۔ وہ تو

---

[1] دالان

شام ڈھلے جب جاکاں مچھانی دیگوں کے لیے پانی لے کر آئی تو اُس نے آہستہ سے روپو کے کان میں کہا۔ ''آج پہر رات گئے۔ مڑھیاں والے کنویں پر وہ تیرا انتظار کرتا ہوگا۔''

یوں روپو کی جان میں جان آئی۔ ساتھ ہی جنج بھی اُتری۔ گاؤں کے وہ لوگ جو اِن دونوں گروہوں کے علاوہ تھے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ بہت خوف سے بھری رازداری تھی۔ شمشیر کہاں ہے؟ شمشیر کہاں ہے؟''

اور وہ کسی ہونی کے انتظار میں تھے۔ وہ بات کب ہونی ہے؟ اور کیسے ہونی ہے؟ یہ کسی کو خبر نہ تھی لیکن یہ یقین ہر بندے کو تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔ سبھی جانتے تھے کہ شمشیر جو معمولی سی بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے اتنی بڑی بات پر کس طرح چپ رہے گا۔ اور شمشیر زخمی شیر کی مانند پھرتا جہاں کہیں نظر پڑتا کسی بندے میں اتنی جرات نہ تھی کہ اُس سے بات کر لیتا اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ''شمشیر کہاں ہے؟''۔ اور ہر بچن بار بار گھر جا کر بے بے سے پوچھتا! ''شمشیر کہاں ہے؟''

اور بے بے اُس وقت سے روپو اور اُس کے گھر والوں کو گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔ اور شمشیر سنگھ اُس وقت اندر سنگھ کو بستر کے پار بڑے آم کے درخت کے نیچے گھوڑیاں پکڑا کر ٹھہرا آیا تھا اور آپ وہ مڑھیوں والے کنویں پر بیٹھا روپو کے انتظار میں تھا۔

رات بہت تاریک تھی۔ کہیں چادر چادر جتنے بادل آسمان پر تیرتے پھرتے تھے۔ ہلکی ہلکی پُروا ہوا چل رہی تھی۔ گاؤں کی طرف سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو شمشیر سنگھ بڑے غور سے گاؤں کی جانب جاتی راہ پر دیکھتا۔ پر پھر ادھر ادھر کوئی گیدڑ ہونک پڑتا اور شمشیر سنگھ کا خیال اُدھر چلا جاتا۔ اُس نے ڈھاٹا اور زیادہ کس کر باندھ لیا اور تلوار کی دھار پر اُنگلی پھیر کے اُس کی دھار دیکھی۔ جسے پورا دِن سان پر وہ تیز کرتا رہا تھا۔ ستاروں کی کہکشاں سر پر آن پہنچی۔ ساتھ ہی ایک آم کے سوکھے پیڑ پر بیٹھا الو بول پڑا۔ شمشیر سنگھ نے گاؤں جانے والی راہ پر نظریں پھیر کے دیکھا۔ اک سایہ سا آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ سایہ کیا آپ روپو چلی آرہی تھی۔ شمشیر سنگھ خاموش بیٹھا رہا۔ روپو قریب آئی تو وہ اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

''بہت دیر لگادی!''

اور روپو اُس کے گرم اور چوڑے سینے سے لگ کر کہنے لگی ''وہاں سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا تھا وہ تو خدا بھلا کرے جاکاں مچھانی کا جو مجھے وہاں سے نکال لائی۔ اور یہ لے

پکڑ۔''

''یہ کیا ہے؟''

''میرے زیورات۔''

اور شمشیر نے زیورات کی پوٹلی چادر کی ڈب میں باندھ لی۔

''اور اب نکل چلیں کوئی گاؤں سے نہ آ جائے اڑیا۔''

''چل۔''

''ہمیں کہاں جانا ہے۔''

''یہاں سے نارووال اور پھر صبح کی پہلی گاڑی پر۔''

''اور پھر آگے؟''

''آگے جدھر خدا لے جائے۔ پر پہلے لائل پور[1] چلیں گے وہاں ایک یار ہے۔ اب جلدی چل۔ ابھی بہت فاصلہ کرنا ہے ہمیں۔''

''پیدل ہی۔''

''نہیں بسنتر کے اُس پار گھوڑیاں کھڑی ہیں اور آگے ہم نے منٹ سیکنڈ......''

''ٹھہر جا بھئی جوان۔''

قریب سے ہی ایک بھاری پر تیز آواز اُبھری۔

روپو سہم کے شمشیر سنگھ کے ساتھ چمٹ گئی اور شمشیر سنگھ نے تلوار کے دستے کو مضبوطی سے ہاتھ ڈال لیا اور رُک گیا۔ آنے والے کا سر اور چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ اور تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس کی بلم کا پھل لشک رہا تھا۔ وہ ہر بچن سنگھ رندھاوا تھا جو بھیڑیے کی مانند شمشیر سنگھ اور روپو کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' شمشیر سنگھ بے وقت روکے جانے پر غصے سے لال پیلا ہو کے بولا۔

''کہاں چلا ہے؟'' ہر بچن سنگھ نے آہستہ سے پوچھا۔

''جہاں مرضی۔''

''یہ ساتھ کون ہے؟''

تجھے نہیں پتا؟'' آگے سے شمشیر غصہ کھا کر کہنے لگا۔

---

[1] فیصل آباد کا پرانا نام۔

''یہ تیرے ساتھ نہیں جاسکتی اس طرح۔ دروازے پر اس کی جنج بیٹھی ہے۔''

''تجھے کیا ہے اِس سے اور اِس کی جنج سے؟''

''بیٹیوں بہنوں کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ سویرے ناک سارے گاؤں کی کٹ جائے گی۔ یہ تمھارے ساتھ نہیں جاسکتی۔''

''اوئے میرا راستہ تو خدا بھی نہیں روک سکتا، تو کون ہے۔ زندگی چاہتا ہے تو سامنے سے ہٹ جا۔''

''شمشیریا! تیری آنکھوں پر جوانی نے پٹی باندھ دی ہے۔ تو بندے کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ مورکھ سوچ تو سہی اگر......''

''راستے سے ہٹ جا اوئے ہربچن سنگھا!'' شمشیر سنگھ نے روپو کو پیچھے ہٹا کے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑی ہوئی تلوار سر سے اوپر نکال لی۔

''اور اگر تیری بہن کی جنج......''

''ہٹ جا اوئے آگے سے۔'' شمشیر سنگھ غصّے سے اندھا ہوچکا تھا۔

اور ہربچن سنگھ چھلانگ مار کے گز بھر پیچھے ہوگیا۔

شمشیر کی نظروں کے سامنے اُس کا مرتا ہوا باپ آ گیا۔

''اوئے پُتر شمشیر، ہربچن بڑا بھائی بھی ہے اور باپ بھی۔''

اُس کی ماں کے سفید کھلے بال اور جھریوں والا چہرہ اُس کے سامنے آ گیا۔

''دیکھ تجھے اُس نے کبھی چھوٹے سے چھوٹا کام نہیں کرنے دیا۔ ایسے بھائی تو واہگورو ساری دُنیا کو دے۔''

اور اندر سنگھ کی آواز اُبھری ''اوئے مُورکھا، ماں جائے بھائی لاکھوں دے کر بھی ہاتھ نہیں آتے۔''

چاچا حاکو کہنے لگا ''اوئے مورکھا! اگر تم ہی علیحدہ علیحدہ ہوگئے تو اِس گھر کا کچھ نہ بچے گا''

اور سامنے اُس کا ماں جایا ہربچن کھڑا تھا۔ جس نے اپنے ہاتھ سے بلم پھینک دی تھی اور کہہ رہا تھا۔

''میرے جیتے جی نہیں میری لاش پر سے ہی گزر کے تو اسے لے جاسکے گا۔'' اور اس کی تنی ہوئی تلوار نیچے آ گئی۔

''ماراوئے! سوچتا کیا ہے بے غیرتا'' ہر بچن نے شمشیر کو للکارا۔

اور شمشیر سنگھ کی تلوار پھر سر سے اُبھری۔ ہر بچن سنگھ نے ڈھاٹا، بکل والی چادر اور پگڑی اُتار کے زمین پر پھینک دی تھیں۔ شمشیر نے ایک بار ہر بچن کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے کھڑا تھا اور پھر اُس نے روپو کی طرف دیکھا۔ جو سہمی ہوئی کبوتری کی مانند ساتھ ہی کھڑی تھی۔

شمشیر سنگھ نے آنکھیں بند کرلیں اور پورے زور سے ہاتھ مارا۔ تلوار روپو کی گردن سے لے کر چھاتی کے نیچے تک گزر گئی اور روپو کے منہ سے صرف ایک چیخ نکلی اور وہ گر پڑی۔ شمشیر نے لہو سے بھری تلوار دور پھینک دی اور وہ ہر بچن سنگھ کے گلے لگ کے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

●●●●●